شذرات

تہذیب مشرق	منظور الحسن	۲

قرآنیات

آل عمران (۳: ۱۵۲-۱۵۵)	جاوید احمد غامدی	۷

معارف نبوی

آخرت میں شدید ترین سزا کا مستحق	معز امجد	۱۳
جنت کی خوش خبری	طالب محسن	۱۵

دین و دانش

ایمانیات (۲)	جاوید احمد غامدی	۲۳

نقطۂ نظر

اسلام کا قانون طلاق	الطاف احمد اعظمی	۲۹
مسجد اور عورت امام ابن حزم کا مسلک (۲)	پروفیسر خورشید عالم	۴۹

سیر و سوانح

بنی اسرائیل میں ایک عظیم رسول کی آمد کی خبر (۱)	خالد مسعود	۵۷
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ	محمد وسیم اختر مفتی	۶۴

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

منظور الحسن

تہذیب مشرق

پیغمبر عربی کے پیرووں نے جب فارس و ہند کی سرزمین کو اسلامی سلطنت میں شامل کیا تو اس خطۂ ارضی میں ایک نئی تہذیب کی بنیاد پڑی۔ لوگ وشنو وشیوا اور یزداں و اہرمن کی رزم گاہوں سے نکل کر وحدہ لاشریک کے مامن میں داخل ہوئے۔ ''وید'' اور ''گیتا'' متروک ہوئیں اور ''قرآن'' کتاب ہدایت کی حیثیت سے رائج ہوا۔ رام و کرشن اور رستم و سہراب کے بجائے ابوبکر و عمر اور عثمان و علی ہیرو قرار پائے۔ ہم ساکنان عجم کی شایستگی اہل عرب کی صلابت سے، ہماری ندرت ان کی سادگی سے، ہماری کم آمیزی ان کی بے تکلفی سے، ہماری وضع داری ان کی راست بازی سے، اور ہماری دانش ان کی متانت سے ہم آہنگ ہوئی۔ عرب و عجم کی اس ہم آہنگی سے رسم و رواج بدلے، آداب معاشرت تبدیل ہوئے، لباس کی وضع قطع میں تبدیلی آئی، کھانے پینے اور رہنے بسنے کے انداز متغیر ہوئے، زبانوں میں ارتقا ہوا اور بالآخر فارس و ہند کی تہذیب ایک نئی تہذیب کی صورت میں صفحۂ ہستی پر نمایاں ہوئی۔ یہی تہذیب ہے جسے تہذیب مشرق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کے عناصر ترکیبی علامہ اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

طلوع ہے صفت آفتاب اس کا غروب
یگانہ اور مثال زمانہ گوناں گوں
نہ اس میں عصر رواں کی حیا سے بے زاری
نہ اس میں عہد کہن کے فسانہ و افسوں

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسم افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال
عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوز دروں

اس تہذیب کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ اس کی بنا خاندان کے استحکام پر استوار ہے۔ اس میں رشتوں کا تقدس ہر حال میں قائم رکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی اسے پامال کرنے کی کوشش کرے تو نہ صرف خاندان، بلکہ معاشرہ اس کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی، بیٹا بیٹی اور میاں بیوی کے رشتوں کے علاوہ دادا، دادی، نانا، نانی، چچا، تایا، ماموں، پھوپھی اور خالہ کے رشتے بھی اپنے انفرادی تشخص کے ساتھ ظہور پذیر ہوتے اور خاندان کے افراد کو رشتوں کی ایک مضبوط لڑی میں پرو دیتے ہیں۔ اس تہذیب میں بزرگوں کے احترام کو ایک عظیم قدر مانا جاتا ہے۔ اولاد جواں عمری میں بھی والدین کی تادیب و تنبیہ کو باعث افتخار سمجھتی ہے۔ گھر میں، بازار میں، محفل میں بزرگوں کا وجود باعث رحمت تصور کیا جاتا ہے اور ان کی خدمت کے لیے مسابقت کو پسند کیا جاتا ہے۔ اس تہذیب میں شوہر، باپ، بھائی اور بیٹے کی حیثیت سے مرد کو خاندان کی کفالت کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ اس کی یہ ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ عورت بیوی، ماں، بہن اور بیٹی کی حیثیت سے گھریلو ذمہ داریاں پوری یک سوئی سے انجام دیتی رہے۔ چنانچہ اس بات کو پسند نہیں کیا جاتا کہ کسی ناگزیر ضرورت کے بغیر خواتین معاشی جدوجہد کے لیے سرگرم ہوں۔ اس تہذیب میں عورت کا اصل دائرۂ عمل اس کا گھر قرار پاتا ہے۔ اس کی تمام توانائی اس کے بچوں کی نشو و نما اور اس کے خاندان کے استحکام پر صرف ہوتی ہے۔ وہ ماں، بہو اور بیوی کے روپ میں اپنا وجود خاندان کی بقا کے لیے وقف کر دیتی ہے۔ ان حیثیتوں میں وہ ایثار و محبت کی لازوال داستانیں رقم کرتی ہے۔ اس تہذیب میں استاد اپنے طلبہ کو محض علوم و فنون سے فیض یاب نہیں کرتا، بلکہ اس کے ساتھ ان کی اخلاقی تربیت کو اپنا مسئلہ بناتا ہے۔ وہ طلبہ کو اپنے بچوں کی طرح انگلی پکڑ کر چلاتا ہے۔ بے دھیانی پر خفگی کا اظہار کرتا ہے اور توجہ پر سراپا شفقت ہو جاتا ہے۔ طلبہ خود رو پودوں کی طرح آپ سے آپ پروان نہیں چڑھتے، بلکہ اپنی تراش خراش اور نشو و نما کی ذمہ داری پورے اعتماد کے ساتھ اپنے استاد کے سپرد کرتے ہیں۔ پہلے وہ پوری یک سوئی کے ساتھ استاد کے رنگ میں رنگتے ہیں اور پھر اسی کے رنگ سے اپنا نیا رنگ نمایاں کرتے ہیں۔ اس تہذیب میں دن فجر سے طلوع ہوتا اور عشا پر مکمل ہو جاتا ہے۔ انسان فطرت کے مقرر کردہ اوقات میں معمولات زندگی انجام دیتے ہیں۔ اس تہذیب میں لباس حیا اور عفت کو ملحوظ رکھ کر

www.javedahmadghamidi.com

وضع کیا جاتا ہے۔ یہ لباس محض تن ڈھاپنے کا سامان نہیں کرتا، بلکہ تہذیبی تشخص کی علامت قرار پاتا ہے۔ بول چال اور میل جول میں شایستگی اس تہذیب کا طرۂ امتیاز ہے۔ تکریم، تکلف، رکھ رکھاؤ اور اپنائیت کے خاص اسالیب ہیں جو اس کی زبانوں میں نمایاں طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ اس تہذیب میں کھانے پینے کے خاص آداب ہیں۔ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا، بسم اللہ پڑھ کر شروع کرنا، دائیں ہاتھ سے کھانا، مل جل کر کھانا، بڑوں کو پہلے پیش کرنا، یہ سب آداب دسترخوان پر اس تہذیب کو اجاگر کرتے ہیں۔ اعزہ اور احباب کے لیے ایثار اور اخلاص کو اس تہذیب میں ایک لازمی قدر کی حیثیت حاصل ہے۔

یہ تہذیب جو ایک ہزار سال تک مشرق کے افق پر سورج کی طرح روشن رہی، گزشتہ تین صدیوں سے روبہ زوال ہے۔ تہذیب مغرب کا استیلا لحہ بہ لحہ بڑھ رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ تہذیب اپنا تشخص کھوتی چلی جا رہی ہے۔ خاندان کی بنیادیں کمزور ہو رہی ہیں، رشتوں میں فاصلے پیدا ہو رہے ہیں، بزرگوں کے احترام کی پہلی سی صورت باقی نہیں رہی، بچے عدم التفات کا شکار ہونے لگے ہیں، باحیا لباس متروک ہوتے جا رہے، بول چال اور تعلقات میں شایستگی کا عنصر کم ہو رہا ہے، آپس میں بے گانگی کی فضا قائم ہونے لگی ہے، عفت اور حیا کے معاملے میں بے پروائی کا رویہ اختیار کیا جانے لگا ہے اور عربی، فارسی اور اردو کے بجائے انگریزی کو ذریعۂ اظہار بنایا جا رہا ہے۔ تہذیب مشرق کے زوال کی یہ صورتیں ہمارے شہروں میں نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ زوال کا یہ سلسلہ جس سرعت سے جاری ہے، اگر اس کی یہی رفتار قائم رہی تو وہ زمانہ دور نہیں جب ہماری یہ تہذیب خدانخواستہ ماضی کا افسانہ بن جائے گی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.net

ہمارے ارباب دین و دانش مسلمانوں کی سیاسی ہزیمت پر نوحہ کناں ہیں، ان کے باہمی افتراق کے درد میں مبتلا ہیں، عامۃ الناس کی فقہ و قانون سے ناواقفیت پر رنجیدہ ہیں، دنیا پر مسلمانوں کے غلبے کے لیے تڑپ رہے ہیں، مگر جس تہذیبی زوال پر انھیں خون کے آنسو رونا چاہیے، وہ اس سے بالکل بے خبر محسوس ہوتے ہیں۔ استاذ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے یہ الفاظ شاید ان کی توجہ اس حادثے کی طرف مبذول کرا سکیں اور وہ ہماری تہذیب کو موت کے منہ میں جانے سے روک لیں:

> ”میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام کی جنگ اگر تہذیب کے میدان میں ہار دی گئی تو پھر اسے عقائد و نظریات کے میدان میں جیتنا بھی بہت مشکل ہو جائے گا۔ اس وجہ سے میں اپنے ان دوستوں کی خدمت میں جو اُردو اور شلوار قمیص اور اس طرح کی دوسری چیزوں پر میرے اصرار کو دیکھ کر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں، بڑے ادب

کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں صرف فکر مغرب ہی کو نہیں، اس کی تہذیب کو بھی اپنے وجود کے لیے زہر ہلاہل سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں جس طرح اس کے فکری غلبہ کے خلاف نبرد آزما ہوں، اسی طرح اس کے تہذیبی استیلا سے بھی برسر جنگ ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اس معرکہ میں فتح کس کی ہوگی، لیکن یہ میرے ایمان کا تقاضا ہے کہ میں اسی طرح پوری قوت کے ساتھ اس سے لڑتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ میں نے جب اپنے زمانۂ طالب علمی میں پہلی مرتبہ ''ضرب کلیم'' کی لوح پر یہ جملہ لکھا ہوا دیکھا کہ: ''اعلان جنگ دور حاضر کے خلاف'' ـــــــ تو حقیقت یہ ہے کہ اس کی معنویت مجھ پر واضح نہیں ہوئی، لیکن اب میں جانتا ہوں کہ دور حاضر سے یہاں اقبال کی مراد کیا ہے، اور اس نے یہ کیوں ضروری سمجھا کہ وہ اس زمانے کے چند باطل نظریات ہی کے خلاف نہیں، بلکہ پورے دور حاضر کے خلاف اعلان جنگ کر دے۔ میں اپنے دوستوں کی خدمت میں بھی یہی عرض کروں گا کہ ہو سکے تو وہ بھی خلوت میں کبھی ''ضرب کلیم'' پڑھیں۔ اس لیے کہ:

فغان نیم شبی بے نوائے راز نہیں''

(مقامات ۹۱)

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(۲۵)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ، حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ، وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ، وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ. مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ، ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ، وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ، وَاللّٰهُ

اللہ نے (اپنی مدد کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا، وہ تو اُس وقت اُس نے پورا کر دیا، جب تم اللہ کے اذن[۲۲۳] سے اُن کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ خود تم نے کمزوری دکھائی اور حکم کی تعمیل میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا اور اُس چیز کو دیکھنے کے بعد (پیغمبر کی) نافرمانی کی جس کے تم آرزومند تھے۔ (یہ حقیقت ہے کہ) تم میں کچھ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کے۔ (چنانچہ) اللہ نے (اِس فتح کے بعد) پھر تمھارا رخ اُن سے پھیر دیا تا کہ تمھاری آزمایش کرے[۲۲۴]، (اِس لیے کہ جو لوگ دنیا کے طالب ہیں، وہ تم سے چھٹ

---

[۲۲۳] اصل میں 'باذنہ' کا لفظ آیا ہے۔ اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جنگ کا جو غیر معمولی نتیجہ پہلے مرحلے میں سامنے آیا، وہ محض تمھاری قوت و تدبر سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مشیت سے آیا تھا۔

[۲۲۴] یہ اس ابتلا کی طرف اشارہ ہے جو احد کے موقع پر مسلمانوں کو پیش آیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... تمام ارباب سیر متفق ہیں کہ اس جنگ میں مسلمانوں کا ابتدائی حملہ بہت کامیاب رہا۔ انھوں نے دشمن پر

ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۵۲﴾

اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ، وَّالرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ فِیۡۤ اُخۡرٰکُمۡ، فَاَثَابَکُمۡ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّکَیۡلَا تَحۡزَنُوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ، وَلَا مَاۤ اَصَابَکُمۡ، وَاللّٰہُ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾

کر الگ ہو جائیں)۔ اور حق یہ ہے کہ اُس نے پھر بھی تمھیں معاف ہی کر دیا[۲۲۵] اور اللہ مسلمانوں پر بڑی عنایت فرمانے والا ہے۔۱۵۲

یاد کرو، جب تم بھاگے جا رہے تھے[۲۲۶] اور کسی کو مڑ کر دیکھ بھی نہیں رہے تھے اور اللہ کا پیغمبر تمھیں پیچھے سے پکار رہا تھا تو اللہ نے تم کو غم پر غم پہنچایا[۲۲۷]، اِس لیے کہ (اِس امتحان سے گزرنے کے بعد آیندہ) کسی چیز کے ہاتھ سے جانے اور کسی مصیبت کے آنے پر تم رنجیدہ خاطر نہ ہو[۲۲۸]، اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس سے باخبر ہے۔۱۵۳

غلبہ پا لیا تھا، لیکن ایک دستہ جو ایک اہم درے کی حفاظت پر مامور تھا اور جس کو حضور کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ کسی حال میں بھی اپنی جگہ کو نہ چھوڑے، قبل از وقت اپنی جگہ چھوڑ کر مال غنیمت سمیٹنے پر مصروف ہو گیا۔ صرف تھوڑے سے آدمی اس دستے کے اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اس چیز سے دشمن کے ایک دستے نے فائدہ اٹھایا اور کاوا لگا کر اس نے پشت سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور یہ حملہ ایسا اچانک اور کامیاب ہوا کہ مسلمان اوسان کھو بیٹھے۔''

(تدبر قرآن ۲/ ۱۹۳)

[۲۲۵] یعنی غلطی تو تم نے ایسی کی تھی کہ اس پر تمھیں سزا ملتی، لیکن اللہ کی عنایت ہے کہ اس نے تم کو معاف کر دیا اور دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے محض ایک ابتلا سے گزارنے کے بعد سلامتی سے گھروں کو واپس آ جانے کا موقع فراہم کر دیا۔

[۲۲۶] اصل میں لفظ 'اصعاد' آیا ہے۔ اس کے معنی کسی چڑھائی کی سمت میں جانے کے ہیں۔ اسی سے 'اصعد فی العدو' کا محاورہ نکلا ہے، جس میں کسی سمت میں منہ اٹھا کر بھاگ کھڑے ہونے کے معنی پیدا ہو گئے ہیں۔

[۲۲۷] اصل میں 'غمًّا بغم' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'ب'، تلبس کے مفہوم میں ہے۔ یعنی پہلے شکست کا غم پیش آیا، پھر اس کے ساتھ ہی لپٹا ہوا ایک دوسرا غم بھی سامنے آ گیا۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا، يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ، وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ، يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ، يَقُوْلُوْنَ: هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ، قُلْ: اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ، يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ

اِس غم کے بعد پھر اللہ نے تم پر اطمینان نازل فرمایا، ایک ایسی نیند کی صورت میں جو تم میں سے کچھ لوگوں پر چھا رہی تھی اور کچھ وہ تھے کہ جنھیں اپنی جانوں کی پڑی تھی۔[۲۲۹] وہ خدا کے متعلق بالکل خلاف حقیقت جاہلیت کے گمانوں میں مبتلا ہو رہے تھے۔[۲۳۰] وہ کہہ رہے تھے کہ ان معاملات میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟ (اِن سے) کہہ دو کہ تمام معاملات اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔ وہ اپنے دلوں میں وہ کچھ چھپائے ہوئے

وضاحت اس طرح فرمائی ہے:

”... ہمارے نزدیک اس غم سے مراد وہ غم ہے جو اس دوران میں مسلمانوں کو کفار کی اڑائی ہوئی اس افواہ سے پہنچا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید کر دیے گئے۔ اس افواہ کا ذکر تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں بھی ہے اور قرآن کی اس آیت سے بھی اس کا اشارہ نکلتا ہے۔ اس لیے فرمایا ہے کہ تم اس طرح بگ ٹٹ بھاگے چلے جا رہے تھے کہ تمھیں اپنے دہنے بائیں کا بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ تم ذرا مڑ کے دیکھ سکتے کہ کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے، یہاں تک کہ اس رسول کی طرف بھی تم نے توجہ نہیں کی جو تمھارے پیچھے سے تمھیں برابر پکارتا رہا کہ اللہ کے بندو، میری طرف آؤ۔ اس کے بعد 'ف' کے ساتھ، جو عربی میں نتیجہ کے بیان کے لیے آتی ہے، اس غم کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ یہ غم پیغمبر کی ذات ہی سے متعلق ہوگا تا کہ پیغمبر کی جو ناقدری ان سے صادر ہوئی ہے، اس پر ان کو تنبیہ کی جائے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۱۹۳)

[۲۲۸] مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے ابتلا اور مصیبتوں سے گزر کر یہ حقیقت تم پر واضح ہو جائے کہ دنیا اصلاً کھونے اور پانے کی نہیں، بلکہ امتحان کی جگہ ہے، لہٰذا اس میں پیش آنے والے ہر حادثے کو اسی زاویۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اس کے بعد توقع ہے کہ تمھارے اندر وہ مایوسی اور دل شکستگی کبھی پیدا نہ ہوگی جو انسان کے عزم و حوصلہ کو ختم کر دیتی ہے اور تم ہمیشہ پا بر جا رہو گے۔

[۲۲۹] یعنی اگرچہ دشمن جا چکا تھا، لیکن جیسا کہ روایتوں میں بیان ہوا ہے، اپنے خوف اور بزدلی کی وجہ سے وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ معلوم نہیں کس وقت وہ دوبارہ ان پر آ پڑے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لَكَ، يَقُوْلُوْنَ: لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ، مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا، قُلْ: لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ، وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ، وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ، وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ، اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ

ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ اس معاملے میں ہمارا کوئی دخل ہوتا تو ہم یہاں اس طرح مارے نہ جاتے[۲۳۱]۔ کہہ دو کہ اگر تم گھروں میں ہوتے تو جن کے لیے قتل ہونا لکھا تھا، وہ اپنی قتل گاہوں تک پہنچ کر رہتے۔ (لہٰذا اس بات کو ایک مرتبہ پھر اچھی طرح سمجھ لو کہ یہ سب محض اِس لیے ہوا کہ اللہ تمھیں الگ الگ کرے[۲۳۲]) اور تمھارے سینوں میں جو کچھ چھپا ہوا ہے، اُس کو پرکھے اور تمھارے دلوں کے کھوٹ چھانٹ دے، اور (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ دلوں کو جانتا ہے۔۱۵۴

تم میں سے جو لوگ دونوں گروہوں کی مڈبھیڑ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے[۲۳۳]، اُن کی اِس لغزش کا سبب یہ تھا کہ اُن کے گناہوں کی شامت سے شیطان نے اُن کے قدم ڈگمگا دیے تھے[۲۳۴]۔ (تاہم) اللہ نے اُنھیں

---

[۲۳۰] اصل الفاظ ہیں: 'يظنون بالله غير الحق ظن الجاهلية'۔ ان میں 'ظن الجاهلية'، 'غير الحق' کی وضاحت ہے اور اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ ان کی بزدلی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سوچنے کا انداز اب تک وہی ہے جو اسلام کی نعمت سے بہرہ یاب ہونے سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں تھا۔

[۲۳۱] ان کا خیال تھا کہ اس جنگ کے بارے میں پیغمبر استبداد اور خودرائی سے کام نہ لیتے اور مدینہ کے اندر محصور رہ کر دشمن کا مقابلہ کرنے کی جو تجویز پیش کی گئی تھی، اسے مان لیتے تو یہ افسوس ناک صورت حال پیش نہ آتی جو اس وقت آئی ہے۔

[۲۳۲] اصل میں 'وليبتلى الله ما فى صدوركم' کے جو الفاظ آئے ہیں، ان میں عطف کی واؤ دلیل ہے کہ یہ پوری بات یہاں عربیت کے اسلوب پر حذف ہے۔

[۲۳۳] یعنی احد کے دن، جب بعض کمزور قسم کے مسلمان عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کی شرارتوں سے متاثر ہو گئے تھے۔

مَا كَسَبُوْا، وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾

معاف کر دیا۔ بے شک، اللہ بخشنے والا ہے، وہ بڑا بردبار ہے۔ ۱۵۵

---

[۲۳۴] یہ قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ ان کی کچھ پچھلی غلطیاں تھیں جن کے سبب سے شیطان انھیں گم راہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... گناہ سے گناہ جنم لیتا ہے اور شیطان کے داؤں انھی لوگوں پر زیادہ آسانی سے کارگر ہوتے ہیں جن کے اندر گناہ کی کوئی جڑ موجود ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جب آدمی سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کو دل میں جگہ نہ پکڑنے دے، بلکہ استغفار اور توبۂ نصوح کے ذریعے سے اس کا استیصال کر دے۔“ (تدبر قرآن ۲/ ۱۹۷)

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معز امجد

آخرت میں شدید ترین سزا کا مستحق

روی[1] ان رسـول الـلّٰـه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: ان اشد الناس عذابا یوم القیامة[2] اشد الناس عذابا للناس فی الدنیا[3].

''روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بے شک، قیامت کے روز سب سے زیادہ تکلیف دہ عذاب کا مستحق وہ شخص ہوگا جو اس دنیا میں لوگوں کو (ناجائز طور پر) سب سے زیادہ تکلیف دہ سزا دے گا[1]۔''

ترجمے کے حواشی

۱۔ یعنی اس دنیا میں جو شخص ناانصافی سے کام لیتے ہوئے جس قدر زیادہ دوسروں کو تکلیف پہنچائے گا، آخرت میں اسی لحاظ سے خدا کی طرف سے اس کی سزا بھی شدید تر ہوگی۔ آخرت میں ہر آدمی اپنے دنیوی اختیارات کے لحاظ سے اپنے پروردگار کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ اختیارات کا ناجائز استعمال یہاں جس قدر زیادہ ہوگا، خدا کے ہاں اس کی پکڑ بھی اسی قدر زیادہ ہوگی۔ اس دنیا میں اپنے اختیارات کا انتہائی غلط استعمال یہ ہوگا کہ کوئی بااختیار آدمی ناانصافی سے کام لیتے ہوئے کسی معصوم کو شدید جسمانی سزا دے۔ جو لوگ یہاں کسی نہ کسی پہلو سے دوسروں کو سزا دینے کا اختیار رکھتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس روایت میں خصوصاً انھیں خبردار کیا ہے کہ وہ لوگوں کو سزا دینے

میں اگر ناانصافی سے کام لیں گے تو آخرت میں انصاف کرنے والے قادر مطلق خدا تعالیٰ کی پکڑ سے وہ بچ نہ سکیں گے، بلکہ انھیں ان کی ناانصافی کے لحاظ سے سخت سے سخت تر سزا ملے گی۔

متن کے حواشی

۱۔ یہ روایت بعض اختلافات کے ساتھ درج ذیل مقامات پر نقل ہوئی ہے:

بیہقی، رقم ۱۶۴۳۷۔ احمد بن حنبل، رقم ۱۶۸۶۵۔ حمیدی، رقم ۵۶۲۔ مسند الطیالسی، رقم ۱۱۵۷۔ مسند الشامیین، رقم ۳۶، ۱۸۷۴۔ المعجم الکبیر، رقم ۱۰۰۷، ۱۲۱۴۔

۲۔ بعض روایات مثلاً حمیدی، رقم ۵۶۲ میں 'یوم القیامة' (قیامت کے روز) کے الفاظ سے پہلے 'عند اللّٰه' (اللہ کے ہاں) کے الفاظ کا اضافہ روایت ہوا ہے۔

۳۔ بعض روایات مثلاً حمیدی، رقم ۵۶۲ میں 'اشد الناس عذابا للناس فی الدنیا' (جو اس دنیا میں لوگوں کو سب سے زیادہ تکلیف دہ سزا دے گا) کے بجائے 'اشدهم عذابا للناس فی الدنیا' (جو اس دنیا میں انھیں سب سے زیادہ تکلیف دہ سزا دے گا) کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔

بعض روایات مثلاً المعجم الکبیر، رقم ۱۲۱۴ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یوں نقل ہوا ہے:

ان اشد الناس عذابا للناس فی الدنیا اشدهم عذابا عند اللّٰه یوم القیامة.

''بے شک جو شخص اس دنیا میں لوگوں کو (ناانصافی سے) سزا دینے میں سخت ترین ہوگا، وہ قیامت کے روز خدا کے ہاں شدید ترین عذاب کا مستحق ہوگا۔''

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ و ترتیب: اظہار احمد

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

طالب محسن

جنت کی خوش خبری

(مسلم، رقم ۳۱)

حدَّثَنَا اَبُو هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: کُنَّا قُعُوْدًا حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ. مَعَنَا اَبُو بَکْرٍ وَعُمَرُ فِی نَفَرٍ. فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ بَیْنِ اَظْهُرِنَا فَاَبْطَا عَلَیْنَا وَخَشَیْنَا اَنْ یُقْتَطَعَ دُوْنَنَا وَفَزِعْنَا فَقُمْنَا فَکُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ. فَخَرَجْتُ اَبْتَغِی رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰی أَتَیْتُ حَائِطًا لِلْاَنْصَارِ لِبَنِی النَّجَّارِ. فَدُرْتُ بِهِ هَلْ اَجِدُ لَهُ بَابًا فَلَمْ اَجِدْ فَاِذَا رَبِیْعٌ یَدْخُلُ فِی جَوْفِ حَائِطٍ مِنْ بِئْرٍ خَارِجَةٍ. وَالرَّبِیْعُ الْجَدْوَلُ. فَاحْتَفَزْتُ کَمَا یَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ. فَدَخَلْتُ عَلَی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ. فَقَالَ: اَبُوْ هُرَیْرَةَ. فَقُلْتُ: نَعَمْ، یَا رَسُولَ اللّٰهِ. قَالَ: مَا شَأْنُكَ؟ قُلْتُ: کُنْتَ بَیْنَ اَظْهُرِنَا. فَقُمْتَ، فَاَبْطَاْتَ عَلَیْنَا. فَخَشِیْنَا اَنْ تُقْتَطَعَ دُوْنَنَا، فَفَزِعْنَا. فَکُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ. فَاَتَیْتُ هٰذَا الْحَائِطَ.

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

فَاحْتَفَزْتُ كَمَا يَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ، وَهٰؤُلَاءِ النَّاسُ وَرَائِی. فَقَالَ: يَا اَبَا هُرَيْرَةَ وَاَعْطَانِی نَعْلَيْهِ. قَالَ: اذْهَبْ بِنَعْلَيَّ هَاتَيْنِ. فَمَنْ لَقِيتَ مِنْ وَرَاءِ هَذَا الْحَائِطِ يَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهُ فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ. فَكَانَ اَوَّلَ مَنْ لَقِيتُ عُمَرُ. فَقَالَ: مَا هَاتَانِ النَّعْلَانِ؟ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ. فَقُلْتُ: هَاتَانِ نَعْلَا رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَنِی بِهِمَا مَنْ لَقِيتُ يَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهُ بَشَّرْتُهُ بِالْجَنَّةِ. فَضَرَبَ عُمَرُ بِيَدِهِ بَيْنَ ثَدْيَيَّ، فَخَرَرْتُ لِاِسْتِی. فَقَالَ: ارْجِعْ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ. فَرَجَعْتُ اِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَجْهَشْتُ بُكَاءً وَرَكِبَنِی عُمَرُ فَاِذَا هُوَ عَلَى اَثَرِی. فَقَالَ لِی رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَا لَكَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ. قُلْتُ: لَقِيتُ عُمَرَ فَاَخْبَرْتُهُ بِالَّذِی بَعَثْتَنِی بِهِ. فَضَرَبَ بَيْنَ ثَدْيَيَّ ضَرْبَةً خَرَرْتُ لِاِسْتِی. قَالَ: ارْجِعْ. فَقَالَ لَهُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: يَا عُمَرُ مَا حَمَلَكَ عَلَى مَا فَعَلْتَ. قَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ، بِاَبِی اَنْتَ وَاُمِّی. اَبَعَثْتَ اَبَا هُرَيْرَةَ بِنَعْلَيْكَ مَنْ لَقِیَ يَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا كَلْبُهُ بَشَّرَهُ بِالْجَنَّةِ. قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: فَلَا تَفْعَلْ فَاِنِّی اَخْشَى اَنْ يَتَّكِلَ النَّاسُ عَلَيْهَا فَخَلِّهِمْ يَعْمَلُونَ. قَالَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَخَلِّهِمْ.

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھ ہوئے تھے۔لوگوں میں ہمارے ساتھ ابوبکر و عمر (رضی اللہ عنہما) بھی تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے بیچ میں سے اٹھے (اور کہیں چلے گئے) آپ نے ہمارے پاس (واپس) آنے میں کافی تاخیر کر دی۔ ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں آپ کو ہم سے ورے ہی (دشمن سے کوئی) تکلیف نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ ہم ڈر

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.net

گئے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ان گھبرانے والوں میں میں سب سے پہلا آدمی تھا۔چنانچہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کرتا ہوا نکلا، یہاں تک کہ میں انصار میں سے بنی نجار کے باغ کے پاس پہنچ گیا۔میں اس کے گرد گھوما کہ کہیں اس کا دروازہ پاؤں۔لیکن مجھے (دروازہ تو) نہیں ملا، (مگر کیا دیکھتا ہوں) کہ ایک نالہ ہے جو باہر والے کنویں سے دیوار کے خلا میں داخل ہو رہا ہے...[1]۔ چنانچہ میں اسی طرح سمٹا جس طرح لومڑی سمٹتی ہے اور اس (راستے سے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گیا۔فرمایا: ابوہریرہ۔میں نے کہا: جی یارسول اللہ۔فرمایا: کیا بات ہے؟ میں نے کہا: آپ ہمارے بیچ تشریف فرما تھے۔پھر آپ اٹھے (تشریف لے گئے) اور آپ نے ہمارے پاس (واپس) آنے میں بہت تاخیر کر دی۔ہمیں اندیشہ ہوا کہ آپ کو ہماری غیر موجودگی میں کوئی تکلیف نہ پہنچی ہو۔ان گھبرانے والوں میں میں سب سے پہلے گھبرایا تھا۔چنانچہ میں (نکلا اور) اس باغ تک آ گیا۔(نالے کے راستے اندر داخل ہونے کے لیے) میں اسی طرح سمٹا جیسے ایک لومڑی سمٹتی ہے۔یہ (دوسرے لوگ) میرے پیچھے ہیں۔فرمایا: ابوہریرہ، اور آپ نے مجھے اپنے جوتے عنایت کیے، میرے یہ جوتے لے جاؤ۔اس دیوار کے پیچھے جو بھی تمھیں ملے اور وہ یہ اقرار کرتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اس بات پر اس کا دل یقین رکھتا ہو تو اسے جنت کی بشارت دینا۔چنانچہ پہلا آدمی جس سے میں ملا (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) تھے۔انھوں نے پوچھا: یہ جوتے کیا ہیں؟ میں نے کہا: یہ جوتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔آپ نے مجھے یہ دے کر بھیجا ہے کہ میں جس سے ملوں اور وہ اس بات کا اقرار کرتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اس کا دل اس پر یقین رکھتا ہو تو اسے جنت کی بشارت دوں۔ یہ سن کر (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور میں پیٹھ کے بل گر گیا۔کہا: ابوہریرہ، لوٹو۔چنانچہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف واپس چل پڑا۔میں رونے کو تھا۔(حضرت) عمر

---

[1] یہاں راوی نے نالے کے لیے آئے ہوئے لفظ 'ربیع' کی توضیح کی ہے کہ اس سے مراد آب پاشی کے لیے بنایا ہوا کھالا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.net

(رضی اللہ عنہ) نے میرے اوپر چڑھائی کی ہوئی تھی اور وہ میرے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ (ہمیں دیکھ کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: ابو ہریرہ تمھیں کیا ہوا؟ میں نے کہا: میری ملاقات عمر سے ہوئی اور میں نے انھیں وہ بات بتائی جو آپ نے مجھے بتانے کے لیے بھیجا تھا۔ لیکن انھوں نے سن کر میرے سینے پر ایسا مارا کہ میں پیٹھ کے بل گر گیا۔ پھر کہا: واپس چلو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عمر، تم نے ایسا کیوں کیا؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ، میرے ماں باپ آپ پر قربان، کیا آپ نے ابو ہریرہ کو جوتے دے کر بھیجا ہے کہ یہ جس سے ملیں اور وہ اقرار کرتا ہو اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کا دل اس پر پوری طرح مطمئن ہو تو اسے جنت کی بشارت دیں۔ آپ نے فرمایا: ہاں۔ انھوں نے کہا: آپ یہ نہ کریں مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ اسی پر بھروسا کرنے لگیں گے۔ لوگوں کو عمل کرنے دیجیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انھیں عمل کرنے دو۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لغوی مباحث

یقتطع دوننا: 'یقتطع' مجہول ہے، یعنی دشمن آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ 'دوننا' سے یہاں صحابہ سے دوری مراد ہے۔

حائط: لفظی طور پر اس سے چار دیواری مراد ہے۔ لیکن یہ باغ کے لیے آتا ہے، کیونکہ باغ کے گرد چار دیواری ہوتی تھی۔

فاجهشت بكاء: روہانسا ہونا، آہ وزاری کرنا۔ یہاں وہ شدید بے کسی کی کیفیت مراد ہے جو حضرت عمر کے سخت ردعمل کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔

معنی

یہ روایت تین حوالوں سے قابل توجہ ہے۔ نمایاں ترین چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابو ہریرہ اور بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے مکالمہ ہے۔ اس میں جو چیز بیان ہوئی ہے، وہ اس سے پہلے کی روایتوں میں زیر بحث

آ چکی ہے۔یعنی ان روایتوں میں قول ایمان سے مراد محض زبان سے ایمانیات کا تلفظ نہیں ہے۔ یہ درحقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب ان صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے لیے خوش خبری ہے جو اس وقت اس کلمے کے بولنے اور ماننے والے بنے، جب یہ کلمہ اجنبی تھا اور اس کا بولنا اپنے جان و مال اور تعلقات کو خطرے میں ڈالنا تھا۔مزید براں یہ وہ لوگ نہیں تھے جو اسے محض ایک علمی حقیقت سمجھتے تھے۔انھیں معلوم تھا کہ اس کلمہ کی حقیقت اسلامی زندگی کے سرعنوان کی ہے۔اس روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ یہ بات اس طرح لوگوں کو نہ بتائی جائے، اسی حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کے نزدیک کلمۂ ایمان محض تلفظ کی چیز نہیں ہے، بلکہ عمل صالح اس کا لازمی تقاضا ہے اور اگر لوگوں نے کہیں اسے اس کے ظاہری مفہوم میں لے لیا تو وہ اس تقاضے کو فراموش نہ کر دیں۔علاوہ ازیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس میں ''دل کے یقین'' کا اضافہ کیا ہے۔ جب کوئی بات دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے تو زندگی کے انداز ہی بدل کے رکھ دیتی ہے۔ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لوگ مسلمان ہیں،لیکن ان کے اخلاق و کردار مسلمانوں والے نہیں ہیں۔اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایمانیات صرف زبان کی نوک پر ہیں۔ دل کی دنیا اس سے کماحقہ آشنا نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے اس قول کو اپنے قلب میں اتار لیتا ہے تو اس کی شخصیت بدلنا شروع ہو جاتی ہے اور وہ اپنے خیالات و اعمال میں موجود برائیوں سے ایک ایک کر کے جان چھڑانے کی راہ پر گام زن ہو جاتا ہے۔ یہ ایمان قیمتی ہے۔اسی ایمان کے حاملین اس رحمت خداوندی کے مستحق ہیں۔ جو لوگ ایمان کی اس سطح سے آشنا ہوتے ہیں، انھیں رحمت اور بخشش کی خبر عمل کے بارے میں مزید مستعد کرتی ہے۔لیکن بعض کے ہاں اس کے برعکس نتیجہ بھی نکل سکتا ہے۔اسی بات کی نشان دہی حضرت عمر نے کی تھی اور اسے مانتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہ کو یہ بات بیان کرنے سے روک دیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ملتی جلتی بات مختلف مواقع پر ارشاد فرمائی ہے۔اس کا سبب کیا ہے؟ ہمارے خیال میں اس سوال کی وجہ داعی کے کلام اور علمی اور تصنیفی زبان کے فرق کو نظر انداز کرنا ہے۔ داعی اپنی بات کو دلوں میں اتارنے کے لیے انذار و تبشیر کے مختلف اسالیب اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے کلام میں دین کے مختلف پہلوؤں کو ایک خاص زور سے بیان کرنے کی متعدد مثالیں نظر آئیں گی۔مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم جہاں یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا وہ جنت میں چلا گیا، وہاں یہ کہتے ہوئے بھی ملتے ہیں، مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔اس اسلوب کا فائدہ یہ ہے کہ مخاطب کی آرا ہی تبدیل نہیں ہوتیں، اس کا دل بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔

دوسرا حوالہ وہ واقعہ ہے جو اس مکالمے کے دروبست کی حیثیت سے اس روایت میں بیان ہوا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ مدینے میں اس وقت پیش آیا جب دشمن سے کسی کارروائی کی توقع کی جا رہی تھی۔ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت ابوہریرہ غزوۂ خیبر کے موقع پر ایمان لائے تھے۔ یہ غزوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کم وبیش چار سال پہلے پیش آیا تھا۔ اس زمانے میں اسلامی حکومت بڑی حد تک مستحکم ہو چکی تھی۔ لہٰذا یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ یہ خطرہ کس گروہ کی طرف سے تھا۔ اہل مکہ سے کسی خلاف مروت عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی اور یہود کی طاقت کا استیصال ہو چکا ہے۔ مزید براں یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ ایسا ہی خطرے کا زمانہ ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے ہی کیوں نکلے تھے۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حالات نارمل تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آنے میں تاخیر ہوئی تو صحابہ کی شدت محبت نے انھیں اندیشوں میں مبتلا کر دیا۔

تیسرا حوالہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک باغ میں جانا ہے۔ اس پر دو پہلووں سے بات ہو سکتی ہے۔ ایک یہ کہ آپ اس باغ میں کیوں گئے تھے۔ دوسرے یہ کہ حضرت ابوہریرہ اس باغ تک کیسے پہنچے۔ ویسے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس باغ میں جانے کے کئی سبب قیاس کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن زیادہ قرین قیاس یہی محسوس ہوتا ہے کہ حضور کا یہ جانا ذاتی نوعیت کا تھا۔ یعنی اس کا سبب حضور کی کوئی داعیانہ سرگرمی نہیں تھی۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس باغ تک کیسے پہنچے تو اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ محض اتفاق ہے۔ لیکن باغ میں داخل ہونے کے طریقے سے یہ بات زیادہ قرین قیاس محسوس ہوتی ہے کہ حضور تفریح طبع کے لیے اس باغ میں جاتے رہتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ کو یہ بات معلوم تھی، اس لیے وہ اسی باغ تک گئے اور اس میں داخل ہونے کی جو صورت پہلے سامنے آئی اسی کو اختیار کر لیا۔ مزید براں حضرت عمر بھی حضور کے پیچھے اسی باغ کی طرف آ رہے تھے یہ بھی اسی بات کا ایک قرینہ ہے کہ حضور کا ادھر آنا ایک معمول کی بات تھی۔

اس روایت کی چند ضمنی باتیں بھی قابل توجہ ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دے کر بھیجتے ہوئے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو جوتے عنایت کیے تھے۔ یہ حضرت ابوہریرہ کو دی گئی خبر کے حضور ہی کی طرف سے ہونے کا سرٹیفیکیٹ تھا۔ اس سے یہ پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ خیال تھا کہ ابوہریرہ کی طرف سے یہ بات ماننے میں لوگ متامل ہوں گے۔ اسی طرح اس واقعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے اپنے بارے میں اضطراب سے بہت خوش ہوئے اور آپ نے یہ چاہا کہ انھیں ان کے ایمان کے ثمر سے آگاہ کریں۔ باقی رہا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بات بیان نہ کرنے کا مشورہ دینا تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ لوگ جملے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کواس کے ظاہری معنی میں لیں گے۔ یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ایک صحابی نے (نعوذ باللہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کے بارے میں رہنمائی دی ہے۔ یہ مسئلہ دین کے بیان کا نہیں تھا۔ دین کے حوالے سے صحابہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطیع تھے اور ان کو بے کم و کاست حضور کی پیروی کرنا تھی۔ یہ معاملہ تدبیر کا تھا اور تدبیر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے صائب مشورے قبول فرماتے تھے۔ حضرت عمر کا مشورہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے عمومی رویے کے عین مطابق تھا۔ ہم اس سے پہلے حضرت معاذ والی روایت میں پڑھ چکے ہیں کہ خود حضور نے حضرت معاذ کو یہی بات کہی تھی۔

اس واقعے میں حضرت عمر نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک سختی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستگی کی ایک لمبی تاریخ رکھتے تھے۔ انھیں حضور کے صحابہ میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ جس کا اظہار اس روایت میں بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ ہم حضور کے گرد بیٹھے تھے اور ہمارے اندر ابو بکر و عمر (رضی اللہ عنہما) بھی موجود تھے۔ حضرت عمر کی سختی ایک بڑے کی اپنے خورد پر سختی ہے۔ روایت کے سیاق و سباق سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو گرانا نہیں چاہتے تھے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ حضرت عمر کے حضرت ابو ہریرہ کو واپس موڑنے کے لیے لگائے گئے ہاتھ نے انھیں گرا دیا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس روایت میں پیٹھ کے لیے 'است' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ 'است' کا لفظ ایک صریح لفظ ہے۔ عام طور پر ایسے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو صریح نہ ہوں اور کہنے والا کنایے کے الفاظ سے اپنی بات ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ نے ایک صریح لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کھلے طریقے سے بات کرنا ناموزوں نہیں سمجھا جاتا تھا۔

متون

یہ روایت صحیح مسلم کے علاوہ صحیح ابن حبان میں نقل ہوئی ہے۔ دونوں کا متن کم و بیش ایک ہے۔ چند لفظی فرق ہیں۔ مثلاً: ابن حبان میں رسول اللہ کے بجائے نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ آئے ہیں۔ 'بين أظهرنا' کی جگہ 'بين ظهرينا' آیا ہے۔ 'فخرجت أبتغي' کے لیے 'فخرجت أتبع' آیا ہے۔ 'فإذا ربيع' سے پہلے 'فلم أجد' کی تصریح نہیں ہے۔ 'من بئر خارجة' کے بجائے 'من خارجه' آیا ہے۔ پہلے 'فاحتفزت' کے ساتھ 'كما

یحتفز' کی وضاحت نہیں ہے۔ 'کنت بین أظهرنا' کی جگہ 'قمت بین أظهرنا' نقل ہوا ہے۔ صاحب مشکٰوۃ نے بھی اپنی کتاب میں یہ روایت لی ہے۔ انھوں نے حوالہ تو مسلم کا دیا ہے، لیکن ان کے متن اور مسلم کے متداول متن میں کچھ فرق ہے۔ متداول متن میں جہاں 'فدرت' کا فعل آیا ہے وہاں صاحب مشکٰوۃ نے 'فساورت' کا فعل نقل کیا ہے۔ اسی طرح اس متن کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'لقیك' کی جگہ 'لقیت' کے الفاظ بولے تھے۔

کتابیات

مسلم، رقم ۳۱۔ ابن حبان، رقم ۴۵۴۳۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

ایمانیات

(۲)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عقلی تقاضا

انسان کے باطن کی اس رہنمائی کے ساتھ یہ صلاحیت بھی اسے دی گئی ہے کہ اپنے ظاہری حواس سے جو کچھ وہ دیکھتا، سنتا اور محسوس کرتا ہے، اس سے بعض ایسے حقائق کا استنباط کرے جو ماوراے حواس ہیں۔ اس کی ایک سادہ مثال قانون تجاذب (Gravitation) ہے۔ سیب درخت سے ٹوٹتا ہے تو زمین پر گر پڑتا ہے۔ پتھر کو زمین سے اٹھانا ہو تو اس کے لیے طاقت خرچ کرنا پڑتی ہے۔ سیڑھیاں اترنے کے مقابلے میں چڑھنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔ چاند اور تارے آسمان میں گردش کرتے ہیں۔ انسان ان چیزوں کو صدیوں سے دیکھ رہا تھا، یہاں تک کہ نیوٹن نے ایک دن انکشاف کیا کہ یہ سب قانون تجاذب کا کرشمہ ہے۔ یہ قانون بذات خود نا قابل مشاہدہ ہے، لیکن اس وقت پوری دنیا اس کو ایک سائنسی حقیقت کے طور پر تسلیم کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نظریہ تمام معلوم حقائق سے ہم آہنگ ہے۔ اس سے تمام مشاہدات کی توجیہ ہو جاتی ہے اور دوسرا کوئی نظریہ ابھی تک ایسا سامنے نہیں آیا جو واقعات سے اس درجہ مطابقت رکھتا ہو۔

یہ، ظاہر ہے کہ محسوس سے غیر محسوس کا استنباط ہے۔ انسان جب اپنی اس صلاحیت کو کام میں لا کر اپنا اور اپنے گردو پیش میں پھیلی ہوئی کائنات کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کا یہ مطالعہ بھی اس کے باطن میں نہاں اسی حقیقت کی گواہی

دیتا ہے۔

چنانچہ وہ دیکھتا ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز حسن تخلیق کا معجزانہ اظہار ہے؛ ہر چیز میں اتھاہ معنویت ہے، غیر معمولی اہتمام ہے؛ حکمت، تدبیر، منفعت اور حیرت انگیز نظم وترتیب ہے؛ بے مثال اقلیدس اور ریاضی ہے جس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ اس کا ایک خالق ہے اور یہ خالق کوئی اندھی اور بہری طاقت نہیں ہے، بلکہ ایک لامحدود ذہن ہے۔ اس لیے کہ طاقت کا ظہور اگر کسی علیم وحکیم ہستی کی طرف سے نہ ہو تو اسے جبر محض ہونا چاہیے، مگر یہ حقیقت ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس میں غایت درجہ موزونیت ہے، بے پناہ توافق ہے، اس سے غیر معمولی فوائد اور عجیب وغریب تغیرات پیدا ہوتے ہیں جو کسی اندھی اور بہری طاقت سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتے۔

یہ حقیقت ناقابل تردید ہے۔ اس کو مانے بغیر انسان کی عقل کسی طرح مطمئن نہیں ہوتی۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اللہ پر ایمان ہی زمین وآسمان کی روشنی ہے۔ انسان کا سینہ اسی سے مطلع انوار ہوتا ہے۔ یہ نہ ہو تو دنیا ایک عالم ظلمات اور اندھیر نگری ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ.

(النور۲۴: ۳۵)

''اللہ ہی زمین وآسمان کا نور ہے۔ (انسان کے دل میں) اس کے نور کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک طاق ہو جس میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس ایسا ہو جیسے ایک چمکتا ہوا تارا۔ یہ چراغ زیتون کے ایسے شاداب درخت کے روغن سے جلایا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اس کا روغن آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑکا پڑتا ہو۔ روشنی پر روشنی! اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے۔ (یہ ایک تمثیل ہے) اور اللہ یہ تمثیلیں لوگوں کی رہنمائی کے لیے بیان کرتا ہے۔ (وہ ہر ایک سے وہی معاملہ کرتا ہے جس کا وہ سزاوار ہے) اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔''

تاہم اس کے ساتھ بعض دوسرے حقائق بھی ہیں:

انسان دیکھتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں مقصدیت ہے۔ ہر چیز اپنی غایت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے، لیکن بحیثیت مجموعی اس دنیا کے وجود کا کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ اس لحاظ سے یہ رام کی لیلا اور نیرو کی تماشا گاہ معلوم ہوتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وہ دیکھتا ہے کہ ہر چیز اپنے وجود ہی سے پکار رہی ہے کہ وہ انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے، لیکن وہ خود کس لیے پیدا کیا گیا ہے؟ دنیا کی کوئی چیز نہیں بتاتی۔

پھر ایسا کوئی انتظام بھی نظر نہیں آتا جو یہ جانچ رہا ہو کہ اس کا اگر کوئی مقصد تخلیق ہے تو اس کے ابنائے نوع میں سے کس نے اسے پورا کیا ہے اور کس نے بے پروائی برتی ہے۔

ہر نعمت کے ساتھ مسئولیت کا شعور انسان کی فطرت میں ودیعت ہے، لیکن اس کو ایک شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں اسے عطا فرمائی ہیں، ان کا حساب دیے بغیر وہ نہایت اطمینان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اسے کوئی نہیں پوچھتا۔

لوگوں کو حق و صداقت پر قائم رکھنا انسانیت کی ضرورت ہے، مگر اس کا کوئی حقیقی محرک اس کو اپنے اندر اور اپنے گردوپیش کی دنیا میں نظر نہیں آتا۔ پھر اس کا ضمیر جو کچھ چاہتا ہے، دنیا کے واقعی حالات اس کے خلاف ہیں۔ اس کا فطری احساس ہے کہ ظلم و انصاف اور خیر و شر میں تمیز کی جائے، لیکن یہ اسی کی دنیا ہے جہاں یہ احساس سب سے زیادہ پامال ہو رہا ہے۔ چنانچہ بہت سے انسان دنیا سے اس طرح گئے ہیں کہ ان کی اچھائی کا ان کو کوئی صلہ نہیں ملا اور بہت سے برے اور سرکش لوگ دنیا سے رخصت ہو گئے، مگر انھوں نے اپنی برائی اور سرکشی کی کوئی سزا نہیں پائی۔

دوسری تمام مخلوقات کے برعکس انسان مستقبل کا تصور رکھتا ہے۔ نباتات، جمادات اور حیوانات میں سے کوئی بھی نہیں جو اپنے اندر یہ تصور رکھتا ہو، لیکن یہ مستقبل اس سے ہمیشہ دور ہی رہتا ہے۔

اس کے نہاں خانۂ وجود میں گہری خواہشیں پوشیدہ ہیں، مگر اس کی یہ خواہشیں بہت کم پوری ہوتی ہیں اور اس کے ارمان بہت نکل کر بھی کم ہی نکلتے ہیں۔ یہاں تک کہ خدا کو مان کر اس کی خدائی کے ظہور کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی جو شدید خواہش انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے، وہ بھی اس دنیا میں کبھی پوری نہیں ہوتی۔

اس کے وجود کی رسائی جہاں تک بھی ہو، اس کے خیال کی پہنچ سے بہت نیچے رہ جاتی ہے۔ وہ آسمان کی وسعتوں، زمین کی نہائیوں اور خود اپنے وجود کے باطن میں اتر جانا چاہتا ہے۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس نے آفتاب کو آغوش میں لینے اور ذروں کا دل چیرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس جدوجہد ہی سے یہ حقیقت اس پر واضح ہو گئی ہے کہ اس کے خیال کی وسعت اور وجود کی صلاحیت میں کوئی نسبت سرے سے قائم ہی نہیں کی جا سکتی۔

اس کو ہمیشہ سے ایک ایسی دنیا کی تلاش ہے، جہاں وہ موجودہ دنیا کے مشکلات و مصائب اور محدودیتوں سے آزاد ہو کر خوشی اور فراغت کی ایک دل پسند زندگی حاصل کر سکے۔ یہ طلب قدیم ترین زمانے سے اس کے اندر موجود

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

رہی ہے۔ لیکن اپنی یہ مطلوب دنیا وہ کبھی نہیں پاتا، بلکہ اپنی حسین تمناؤں کو دل ہی میں لیے ہوئے موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔

اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ اور اس کے اعضا و جوارح سے صادر ہونے والے تمام اعمال کائنات کے پردے پر اس طرح نقش ہو رہے ہیں کہ کسی بھی وقت ان کو نہایت صحت کے ساتھ دہرایا جا سکے۔ وہ جو کچھ سوچتا اور جو اچھا یا برا خیال اس کے دل میں گزرتا ہے، اس کے صفحۂ وجود پر اس طرح ثبت ہو جاتا ہے کہ پھر کبھی محو نہیں ہوتا۔ وقت کی رفتار اور حالات کی تبدیلی، کوئی چیز بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ لیکن اس اہتمام کا مقصد کیا ہے؟ یہ دنیا کی کسی چیز سے واضح نہیں ہوتا۔

انسان کی شخصیت اس کے جسم سے الگ اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہے۔ اس کا جسم جن ان گنت خلیوں سے بنا ہے، وہ برابر ٹوٹتے رہتے ہیں اور بار بار پرانا ہونے کے بعد وہ نیا ہوتا رہتا ہے، لیکن اس کی اصل شخصیت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اس کا علم، حافظہ، آرزوئیں اور عادات و خیالات، سب وہی رہتے ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ پھر یہ شخصیت کہاں سے آتی اور کہاں جاتی ہے؟ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا۔

وہ جس زمین پر رہتا ہے۔ اس سے لاکھوں گنا بڑی زمینیں آسمان میں گردش کر رہی ہیں، مگر ان میں زندگی کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ پھر یہ کس لیے پیدا کی گئی ہیں؟ وہ نہیں جانتا۔

یہ حقائق ہیں جو انسان کو بالکل آخری درجے میں مضطرب کر دیتے ہیں، لیکن جیسے ہی یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس دنیا کے ساتھ ایک آخرت بھی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سارے خلا بھر گئے ہیں، ہر سوال کا جواب مل گیا ہے، تمام معلوم شواہد کی توجیہ ہو گئی ہے اور ہر چیز اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک بیٹھ گئی ہے۔ آخرت کو نہ ماننے کی صورت میں جو دنیا ادھوری معلوم ہو رہی تھی، وہ مکمل نظر آنے لگی ہے۔ کائنات کا اصلی حسن و جمال بے نقاب ہو گیا ہے۔ انسان اب اس یقین کے ساتھ دنیا میں رہ سکتا ہے کہ جس مطلوب چیز کو وہ مرنے سے پہلے نہیں پا سکا، اسے موت کے بعد لازماً پا لے گا۔ باقی کائنات میں جس طرح ہر طرف یقین اور تسکین ہے، وہ اسے بھی حاصل ہو جائے گی۔ اس کے اندر جو لامحدود خواہشیں اور تمنائیں ہیں، ان کے پورا کرنے کے لیے ایک لامحدود دنیا اسے ہمیشہ کے لیے دے دی جائے گی، جہاں ایک طرف لذت، نفاست اور معنویت کی ابدی بہشت ہو گی اور دوسری طرف وہ دوزخ بھی ہو گی جس میں ظالم اپنے گناہوں کی سزا بھگتیں گے۔

اس کے نتیجے میں، ظاہر ہے کہ دنیا اور آخرت میں وہی تعلق قائم ہو جاتا ہے جو زوجین کے ہر فرد کا ایک دوسرے

کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر سلیم الفطرت انسان تسلیم کر لیتا ہے کہ اگر علل اپنے معلولات کے ساتھ، قویٰ آلات کے ساتھ، طبائع ارادوں کے ساتھ اور ارواح اجسام کے ساتھ جوڑ دیے گئے ہیں اور اسی کے نتیجے میں اپنی معنویت کا اظہار کر رہے ہیں تو آخرت بھی دنیا کے لیے بمنزلۂ زوج ہے جس کے ساتھ جوڑ کر اسے بامعنی بنا دیا گیا ہے:

وَمِنۡ كُلِّ شَیۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَیۡنِ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ. (الذاریات ۵۱:۴۹)

''اور ہم نے ہر چیز کے جوڑے بنائے ہیں تا کہ تم یاددہانی حاصل کرو۔''

یہی موقع ہے، جب عقل مجبور ہو جاتی ہے کہ جس طرح وہ استنباط کے ذریعے سے حاصل ہونے والے دوسرے تمام معلومات کو علمی حقائق کی حیثیت سے تسلیم کرتی ہے، اسی طرح خدا اور آخرت کو بھی تسلیم کر لے۔ اس کے بعد ہر حساس انسان کا دل جزا و سزا کے تصور سے کانپ اٹھتا ہے اور قیامت کو وہ گویا اپنے سامنے آتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ زمین و آسمان میں وہ اسی طرح بوجھل ہو رہی ہے، جس طرح حاملہ کا حمل ہوتا ہے جس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ کب ظاہر ہو جائے:

یَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ السَّاعَةِ، اَیَّانَ مُرۡسٰهَا؟ قُلۡ: اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّیۡ، لَا یُجَلِّیۡهَا لِوَقۡتِهَاۤ اِلَّا هُوَ، ثَقُلَتۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ، لَا تَاۡتِیۡكُمۡ اِلَّا بَغۡتَةً. (الاعراف ۷:۱۸۷)

''وہ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کب آئے گی؟ کہہ دو کہ اس کا علم تو میرے رب ہی کے پاس ہے۔ وہی اس کا وقت آ جانے پر اس کو ظاہر کر دے گا۔ زمین و آسمان اس سے بوجھل ہو رہے ہیں۔ وہ تم پر اچانک ہی آ پڑے گی۔''

وہ پکار اٹھتا ہے کہ پروردگار، دنیا کا یہ کارخانہ تو نے عبث نہیں بنایا۔ تیری شان علم و حکمت کے منافی ہے کہ تو کوئی بے مقصد کام کرے۔ میں جانتا ہوں کہ اس جہان رنگ و بو کا خاتمہ لازماً ایک روز جزا پر ہو گا جس میں وہ لوگ عذاب اور رسوائی سے دوچار ہوں گے جو تیری اس دنیا کو کھلنڈرے کا کھیل سمجھ کر اس میں زندگی بسر کرتے رہے۔ ان کے انجام سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں:

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ، وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ، الَّذِیۡنَ یَذۡكُرُوۡنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوۡدًا، وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ، وَیَتَفَكَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ، رَبَّنَا، مَا

''زمین و آسمان کی خلقت میں اور شب و روز کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ اُن کے لیے جو اٹھتے، بیٹھتے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں۔ (ان کی دعا

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

خَـلَـقْـتَ هٰـذَا بَـاطِلاً، سُبْـحٰنَكَ، فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ. (آل عمران۳:۱۹۰-۱۹۱)

یہ ہوتی ہے کہ) پروردگار، تو نے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو اس سے پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے۔ سو ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔''

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

الطاف احمد اعظمی

اسلام کا قانون طلاق

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے قانون طلاق کو موجودہ دور کے جملہ قوانین طلاق پر برتری حاصل ہے۔اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔اول الذکر وحی پر مبنی قانون ہے یعنی اس کا ماخذ خداے علیم وخبیر کی ذات ہے جس میں کوئی تبدیلی اور تغیر ممکن نہیں، اوراسی کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق اس جہان آب وگل کی ہر چھوٹی بڑی چیز اپنے طبعی وظائف انجام دے رہی ہے اوراس میں حد درجہ توافق وسازگاری ہے، کہیں معمولی قسم کا بھی کوئی اختلاف ونزاع نہیں ہے۔سب موجودات کی جبین نیاز اس حاکم مطلق کے آگے جھکی ہوئی ہے۔اس کے برخلاف دوسرا قانون وہ ہے جس کا ماخذ انسان کا ذہن ہے جو اپنے تمام حیرت انگیز کمالات کے باوجود بہر حال نقص وتغیر کے عیب سے خالی نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ارتقائی عمل رکھتا ہے، یعنی نقص سے گزر کر کمال تک پہنچتا ہے اور یہ کمال بھی اضافی ہے، مستقل اور قائم بالذات نہیں ہے۔ایک خاص وقت اور زمانے میں جو چیز اکمل وکامل سمجھی جاتی ہے، وہ آگے چل کر حالات کے تغیر کے ساتھ ناقص بن جاتی ہے۔اس کا اطلاق انسان کے وضع کردہ قوانین پر بھی ہوتا ہے خواہ وہ کسی دور میں بنایا گیا ہو اوراس کے بنانے والے کتنے ہی جلیل القدر ماہرین قانون ہوں۔

لیکن اس واضح حقیقت کے باوجود کیا سبب ہے کہ تقریباً ہر دور میں خدا کے قانون کے مقابلے میں انسانی قانون

کو ترجیح دی گئی ہے اور آج بھی یہ صورت برقرار ہے۔ اس کی وجہ راقم سطور کے نزدیک یہ ہے کہ ہر زمانے میں ایک مختصر وقت کے بعد خدا کا قانون اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہا، اس میں تاویل و تفسیر کی شکل میں انسانی ذہن شامل ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے کلی قوانین کے مقابلے میں فقہا کے وضع کردہ جزئی قوانین پر زیادہ توجہ مرکوز ہو گئی اور ان کو کلی اصولوں کی طرح غیر متغیر سمجھ لیا گیا جیسا کہ اس وقت اسلامی قوانین کا حال ہے، اور اس کا قانون طلاق بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ خدا کا کلی قانون کچھ اور تھا اور تقلید پرست اور جزئیات کے دل دادہ علما و فقہا کی قیل و قال نے اس کو کچھ اور بنا دیا ہے جیسا کہ آگے قارئین دیکھیں گے۔

نکاح کی حیثیت

اسلام کی نظر میں نکاح کی حیثیت غیر معمولی ہے اور اس کو میثاق غلیظ یعنی پختہ عہد سے تعبیر کیا گیا ہے: 'وَاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقاً غَلِيْظاً' (النساء۴: ۲۱) ''اور وہ (منکوحہ عورتیں) تم سے میثاق غلیظ (پختہ عہد) لے چکی ہیں۔'' اس آیت سے معلوم ہوا کہ نکاح دراصل ایک سماجی معاہدہ ہے جس کے دو فریق ہیں، مرد اور عورت۔ اسلام میں معاہدے کی پابندی پر بہت زور دیا گیا ہے، خواہ یہ معاہدہ دو افراد کے درمیان ہو یا دو قوموں کے درمیان، اور خواہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہو۔ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات پر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے عہد کو پورا کریں اور اس کو توڑنے سے گریز کریں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا گیا ہے:

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلاً. (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۴)

''عہد کو پورا کرو، بے شک عہد کی باز پرس ہونے والی ہے۔''

قرآن مجید میں متقین کی جن اہم صفات کا ذکر ہوا ہے، ان میں ایک اہم صفت عہد کی پابندی ہے، فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ. (المومنون ۲۳: ۸)

''اور وہ (اپنے پاس رکھی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہد و پیماں کا خیال رکھنے والے ہیں۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ. (آل عمران ۳: ۷۶)

''جس نے اپنے عہد کو پورا کیا اور اس کی خلاف ورزی سے بچا تو بے شک، اللہ ایسے ہی خدا ترسوں کو پسند کرتا ہے۔''

اگر یہ عہد و پیماں کفار اور مسلمانوں کے درمیان ہو تب بھی یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اس کی پاس داری کریں اور اس

کو ناحق توڑنے سے بچیں، فرمایا ہے:

كَيُفَ يَكُوُنُ لِلْمُشُرِكِيُنَ عَهُدٌ عِندَ اللّٰهِ وَعِنُدَ رَسُولِهٖٓ إِلَّا الَّذِيُنَ عَاهَدتُّمُ عِندَ الُمَسُجِدِ الُحَرَامِ فَمَا اسُتَقَامُوُا لَكُمُ فَاسُتَقِيُمُوُا لَهُمُ. (التوبہ۹:۷)

''مشرکین کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک کیسے (قابل لحاظ) رہے گا بجز ان کے جن سے تم نے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا ہے۔ پس جب تک وہ تم سے سیدھی طرح رہیں (یعنی معاہدے پر قائم رہیں) تم بھی ان سے سیدھی طرح رہو (یعنی معاہدے پر قائم رہو)۔''

یہودی قوم جن وجوہ سے اللہ کی نظر میں مبغوض ٹھہری، ان میں سے ایک بڑی وجہ ان کی عہد شکنی ہے۔ قرآن مجید میں اس قوم کی عہد شکنی کا ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ہے:

أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوُا عَهُداً نَّبَذَهُ فَرِيُقٌ مِّنُهُمُ. (البقرہ۲:۱۰۰)

''اور جب بھی ان لوگوں نے کوئی عہد و پیماں کیا تو ان کے کسی فریق نے اس کو ضرور پس پشت ڈالا ہے۔''

تحفظ نکاح

آیات مذکورہ سے واضح ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں عہد و پیماں کی غیر معمولی اہمیت ہے اور عہد شکنی کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ نکاح جیسا کہ اوپر بیان ہوا، ایک معاہدہ ہے جو زوجین کے درمیان ان کی باہمی رضا مندی سے طے پاتا ہے۔ یہ معاہدہ ایک خاندان (فیملی) کی بناڈالنے اور مل جل کر ازدواجی زندگی گزارنے سے متعلق ہوتا ہے۔ جس طرح دوسرے سماجی معاہدات مختلف اسباب سے ٹوٹ جاتے ہیں، اسی طرح معاہدۂ نکاح کا ٹوٹ جانا بھی عین ممکن ہے۔ لیکن دوسرے سماجی معاہدات، مثلاً معاہدۂ بیع وشراء، کے مقابلے میں معاہدۂ نکاح کا ٹوٹ جانا اپنے عواقب و اثرات کے لحاظ سے ایک خطرناک چیز ہے۔ اس لیے اسلامی شریعت نے اس معاملے میں غایت درجہ حزم واحتیاط سے کام لینے کی ہدایت کی ہے۔ چنانچہ اسلامی شریعت نے ان تمام ضروری احتیاطی تدابیر کو بیان کیا جن سے نکاح کا تحفظ ہو اور طرفین میں اختلاف ونزاع واقع نہ ہو۔ ان احتیاطی تدابیر کو ہم یہاں اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

۱۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو جن میں مرد اور عورت، دونوں شامل ہیں، ہدایت کرتا ہے کہ وہ شادی سے پہلے خوب غور و فکر کر لیں اور جن امور کی تفتیش و تحقیق ضروری ہو، ان کی خوب اچھی طرح تحقیق کر لیں۔ یہاں تک کہ اگر مرد اپنی زیر تجویز بیوی کو دیکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہو تو شریعت اجازت دیتی ہے کہ وہ اس کو کسی عمدہ بہانے سے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

دیکھ لے۔ یہی اختیار لڑکی کے ولی کو دیا گیا ہے اور اس کو ہدایت کی گئی ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر شادی نہ کی جائے۔ اگر کسی لڑکی کا نکاح حد بلوغ کو پہنچنے سے پہلے کر دیا گیا ہے تو اسلامی شریعت اس کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ بلوغت کی منزل میں قدم رکھتے ہی اگر چاہے تو اس نکاح کو ختم کر دے۔ معلوم ہوا کہ طرفین کی مرضی کے بغیر اسلام میں نکاح ممنوع ہے۔

لیکن موجودہ مسلم معاشرے میں نکاح کے اس زریں اسلامی اصول کو جس نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، وہ سب پر عیاں ہے۔ یہ امر نہایت برا سمجھا جاتا ہے کہ مرد کسی بہانے سے اس لڑکی کو دیکھ لے جو اس کی شریک حیات بننے والی ہے۔ اسی طرح عورت سے اس کی مرضی معلوم کرنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ آج بہت سی شادیاں طرفین کی رضامندی کے بغیر انجام پاتی ہیں۔ یہ غیر اسلامی رواج ان مسلمانوں میں زیادہ ہے جو غیر تعلیم یافتہ ہیں یا رواجی مذہب کے دل دادہ ہیں۔ اس طرح کی شادیاں بسا اوقات زوجین کے لیے غیر مفید، بلکہ تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں۔ اور اس کا لازمی نتیجہ طلاق کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر مذکورہ اسلامی اصول کی پیروی کی جائے تو حفظ نکاح آسان ہوگا۔

۲۔ کوئی مرد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا ہے کہ اس میں سب خوبیاں ہیں، عیب ایک بھی نہیں ہے، اور نہ کوئی عورت اس بات کی مدعی ہو سکتی ہے۔ اس لیے معاشرتی زندگی کا ایک سنہرا اصول یہ ہے کہ خامیوں سے صرف نظر کیا جائے اور خوبیوں پر نظر رکھی جائے۔ اسی صورت سے عائلی زندگی کی گاڑی صحیح خطوط پر چل سکتی ہے۔

زوجین کے درمیان خوش گوار تعلقات کے قیام کے لیے مذکورہ اصول کی پیروی نہایت ضروری ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ مرد اور عورت اپنی نفسیات اور طبائع کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف، بلکہ متضاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ کمال علم وقدرت ہے کہ اس نے ضدین میں نہ صرف اتحاد پیدا کر دیا، بلکہ دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لیے ایک ناگزیر سماجی ضرورت بن گیا ہے۔ ان میں سے کوئی ایک فریق دوسرے فریق کو نظر انداز کر کے کبھی خوش گوار زندگی نہیں گزار سکتا۔ ضدین کے اس اتحاد کو قرآن مجید میں وجود خدا کی ایک بڑی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ (الروم ۳۰: ۲۱)

اس اتحاد میں بھی اختلاف کا فطری عنصر، بہر حال موجود ہوتا ہے۔ اس لیے فریقین پر واجب ہے کہ وہ ہر حال میں فطرت کے اس اختلاف پر نظر رکھیں اور اس کو اس کی فطری حد سے کبھی آگے بڑھنے نہ دیں۔ مرد ہمیشہ سوچے کہ اگر اس کی بیوی کے اندر کوئی کمی یا خامی ہے تو اس میں کوئی خوبی بھی ضرور ہوگی اور عجب نہیں کہ جو کمی ہے وہ اس کے حق میں باعث خیر ہو۔ اس حکیمانہ پہلو کی طرف قرآن مجید میں ان لفظوں میں مردوں کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى أَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا. (النساء۴:۱۹)

’’بیویوں کے ساتھ بھلے ڈھنگ سے زندگی گزارو اگرچہ وہ تم کو ناپسند ہوں۔ عین ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھ دی ہو۔‘‘

۳۔ طلاق کے اسباب میں دو سبب کثیر الوقوع ہیں، ایک مرد کی جانب سے عورت کے نان ونفقہ کی عدم ادائیگی اور اس کے ساتھ حسن سلوک میں کمی یا اس کا فقدان، اور دوسرے عورت کی زبان درازی اور نافرمانی۔ چنانچہ قرآن مجید میں مردوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ خوش اطواری کے ساتھ زندگی گزاریں (النساء۴:۱۹)، ان کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کریں اور لڑائی جھگڑے کے بجائے صلح جوئی کی روش اختیار کریں، فرمایا گیا ہے:

وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا وَالصُّلْحُ خَيْرٌ وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ وَإِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا. (النساء۴:۱۲۸)

’’اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بے پروائی کا قطعی احتمال ہو تو اس امر میں کوئی مضایقہ نہیں کہ دونوں باہم ایک خاص طور پر صلح کر لیں، اور صلح بہتر ہے۔ اور طبیعتوں میں حرص پیوستہ ہے۔ اگر تم (اپنی عورتوں کے ساتھ) اچھا برتاؤ کرو گے اور (برے سلوک) سے بچو گے تو یاد رکھو کہ اللہ تمھارے اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اسی طرح عورتوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے شوہروں کی اطاعت کریں۔ قرآن میں انھی عورتوں کو صالح کہا گیا ہے جو اپنے شوہروں کی بات مانتی ہیں اور اپنی عفت و پاک دامنی کی حفاظت کرتی ہیں۔ (النساء۴:۳۴)

آج کل بہت سی جدید تعلیم یافتہ خواتین یہ سمجھتی ہیں کہ شوہروں کی اطاعت کا حکم دے کر اسلام نے ان کا مرتبہ گھٹایا ہے۔ گھٹایا نہیں، بڑھایا ہے۔ فیملی کی حیثیت ایک ادارے کی سی ہے اور دوسرے سماجی ادارات کی طرح یہاں بھی ضروری ہے کہ ایک منتظم ہو جس کی بات مانی جائے۔ قرآن مجید کا فیصلہ ہے کہ یہ حیثیت مرد کو حاصل ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرد ڈکٹیٹر بن جائے۔ فیملی کے منتظم ہونے کی حیثیت سے یہ بات اس کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ عورت کے ساتھ حسن سلوک کرے اور اس کے حقوق کسی لیت ولعل کے بغیر ادا کرے۔ اس حسن سلوک اور خبر گیری کے عوض میں عورت کے ذمہ شوہر کی اطاعت ہے۔ اگر ایک فریق نے بھی اپنے فرائض سے پہلو تہی کی تو پھر ازدواجی زندگی کا قیام واستحکام ناممکن ہے۔ خاندان کی بقا کا تقاضا ہے کہ فریقین اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی پر توجہ

دیں۔طلاق کی نوبت آتی ہی اس وقت ہے جب کسی فریق کی جانب سے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی سرزد ہوتی ہے۔

قبل طلاق کے مراحل

مسلمانوں میں ان کی نادانی اور علما کی غلط رہنمائی کی وجہ سے یہ غلط رواج عام ہو گیا ہے کہ فوراً ہی طلاق دے دی جاتی ہے۔ یہ اسلام کے قانون طلاق کی صریح خلاف ورزی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس طرح کی طلاق واقع ہی نہیں ہوتی۔اگر یہ فعل کسی حقیقی اسلامی ریاست میں واقع ہو تو طلاق دینے والا سخت سزا پائے گا۔اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جس کے قانون طلاق میں تدریج کا اصول بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔اگر کوئی مسلمان اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا ہے تو اس کو اس عمل سے پہلے چند مراحل سے گزرنا ہوگا ،اس کے بعد ہی طلاق کا مرحلہ آئے گا۔ان تدریجی مراحل کی تفصیل درج ذیل ہے۔

عورتوں کے احساسات وجذبات بڑے نازک ہوتے ہیں، وہ نازک آبگینہ کی مانند ہیں کہ ذرا سی ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ عورتیں معمولی معمولی باتوں پر بہت جلد برافروختہ ہو جاتی ہیں اور بسا اوقات ان کی یہ برافروختگی شوہر کی نافرمانی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔عورتوں کی اس فطری کمزوری کی وجہ سے قرآن مجید میں مردوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ اگر عورتیں نافرمانی کریں تو مشتعل نہ ہوں اور ردعمل میں کوئی عاجلانہ فیصلہ نہ کر بیٹھیں، بلکہ صبر سے کام لیں۔ مردوں کی دانائی اس میں ہے کہ وہ ان کے ساتھ دل داری کا معاملہ کریں اور محبت سے سمجھائیں۔اگر اس کے باوجود وہ نافرمانی سے باز نہ آئیں تو ان کو خواب گاہ سے علیحدہ کر دیا جائے۔ یہ تدبیر بھی ناکام ہو جائے اور وہ عدم تعاون کی روش نہ چھوڑیں تو پھر بادل نخواستہ ان کو جسمانی سزا دی جائے (النساء۴: ۳۴) شاید اس طرح وہ رجوع کر لیں اور طلاق کی نوبت نہ آئے۔

بہت سی عورتیں اور بعض مرد بھی یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے نافرمان عورتوں کو جسمانی سزا کا حکم دے کر ان کی سخت توہین کی ہے۔ یہ ان کی کم فہمی ہے۔انھوں نے اس سزا کو اس کے مخصوص محل سے الگ کر کے دیکھا،اس لیے اس سزا کی حکیمانہ مصلحت کو وہ سمجھ نہیں سکے۔قرآن مجید نے یہ سخت سزا اس لیے تجویز کی ہے کہ طلاق واقع نہ ہو۔دوسرے لفظوں میں اس نے خاندان کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے اس آخری اور بظاہر ناپسندیدہ تدبیر کو بھی اختیار کر لیا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں طلاق کس درجہ ناپسندیدہ چیز ہے۔اس نے یہ تو گوارا کر لیا کہ نافرمان عورت کو جسمانی سزا دی جائے،لیکن اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ اس عورت کو چھوڑ دیا جائے اور اس کی نادانی کی وجہ سے خود

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اس کا اور اس کے بچوں کا مستقبل تاریک ہو جائے۔

اس کے علاوہ جسمانی سزا کا حکم اس صورت میں دیا گیا ہے جب پہلی دو صورتیں (افہام اور خواب گاہ سے علیحدگی) ناکام ہو جائیں۔ ان تدابیر کی ناکامی اس امر کا ثبوت ہو گا کہ عورت کے اندر منفی داعیات بہت سخت ہیں۔ ایک نارمل عورت کے لیے یہی سزا بہت کافی ہے کہ شوہر اس سے تعلق زن وشو ختم کر لے۔ لیکن اگر کوئی عورت یہ سزا بھی جھیل جاتی ہے اور نافرمانی کی روش نہیں چھوڑتی تو اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کی فطرت میں سرکشی ہے۔ لیکن اسلام اس سرکش عورت کو بھی چھوڑنے کا حکم نہیں دیتا، بلکہ اس کو راہ راست پر لانے کے لیے جسمانی سزا تجویز کرتا ہے تاکہ وہ نافرمانی کی راہ چھوڑ دے اور شوہر کی مطیع وفرماں بردار بن جائے۔ اور اس طرح وہ طلاق کے تباہ کن نتائج سے محفوظ ہو جائے۔

لیکن اگر جسمانی سزا بھی بے اثر ثابت ہو اور عورت بدستور نشوز کی روش اختیار کیے رہے تو ہر منصف مزاج شخص کا یہی فیصلہ ہو گا کہ اب طلاق کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ لیکن اسلامی قانون کی خوبی دیکھیں کہ وہ اب بھی توقف اختیار کرتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ مرد اور عورت، دونوں کے خاندان سے ایک ایک فرد بطور حکم لیا جائے اور ایک فیملی کورٹ بنائی جائے۔ یہ کورٹ اس بات کی حتی المقدور کوشش کرے کہ طرفین میں مصالحت ہو جائے اور طلاق واقع نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر وہ صدق دل سے باہم ملنا چاہیں گے تو وہ ان میں اتحاد پیدا کر دے گا۔ (النساء ۴: ۳۵)

اگر فیملی کورٹ بھی فریقین کے درمیان صلح کرانے میں کامیاب نہ ہو تو اس وقت اسلام مرد اور عورت، دونوں کو جدا ہو جانے کا اختیار دیتا ہے۔ مرد کو یہ اختیار طلاق کی صورت میں اور عورت کو خلع کی شکل میں حاصل ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قانون طلاق

قرآن مجید کی ایک سے زیادہ سورتوں میں اسلام کے قانون طلاق کا ذکر آیا ہے، مثلاً سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا ہے:

الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ فَلَا	”طلاق دو مرتبہ ہے پھر خواہ رکھ لینا قاعدہ کے موافق، خواہ چھوڑ دینا خوش اسلوبی کے ساتھ۔ اور تمھارے لیے یہ بات حلال نہیں کہ (وقت رخصت) اس میں سے کوئی چیز بھی واپس لو جو تم نے ان کو دے رکھی ہے۔ مگر اس وقت جب میاں بیوی کو احتمال ہو کہ وہ اللہ کے حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے، اور تم کو بھی

تَعْتَدُوْهَا وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ
فَأُوْلٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلاَ
تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنكِحَ زَوْجاً غَيْرَهُ
فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ أَنْ
يَّتَرَاجَعَآ إِنْ ظَنَّآ أَنْ يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ
وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ
وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ
فَأَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ أَوْ سَرِّحُوْهُنَّ
بِمَعْرُوْفٍ وَّلاَ تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا
لِّتَعْتَدُوْا وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ
نَفْسَهُ وَلاَ تَتَّخِذُوْٓا آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا
وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ أَنْزَلَ
عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ
بِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ
شَيْءٍ عَلِيْمٌ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ
أَجَلَهُنَّ فَلاَ تَعْضُلُوْهُنَّ أَنْ يَّنْكِحْنَ
أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ
ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذٰلِكُمْ أَزْكٰى لَكُمْ
وَأَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لاَ تَعْلَمُوْنَ.

(البقره۲:۲۲۹۔۲۳۲)

(اے مسلمانو،) یہ اندیشہ ہو کہ وہ دونوں خداوندی ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دے کر عورت گلو خلاصی حاصل کر لے۔ یہ خدائی ضابطے ہیں، ان ضابطوں سے ہرگز تجاوز نہ کرو۔ اور جو شخص حدود اللہ سے تجاوز کر جائے تو ایسے ہی لوگ اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں۔ پھر اگر کسی نے (تیسری مرتبہ) عورت کو طلاق دے دی تو اب وہ اس کے لیے حلال نہ ہوگی یہاں تک کہ وہ اس کے سوا ایک اور خاوند کے ساتھ (عدت کے بعد) نکاح کرے۔ پھر اگر یہ (دوسرا) خاوند اس کو طلاق دے دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ دوبارہ مل جائیں بشرطیکہ دونوں حدود اللہ کو قائم رکھنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اور یہ خداوندی ضابطے ہیں۔ اللہ ان ضابطوں کو ان لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے جو اہل دانش ہیں۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو پھر وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو ان کو قاعدہ کے موافق روک لو یا قاعدہ کے موافق ان کو رخصت کر دو۔ ان کو ستانے کی غرض سے ہرگز نہ روکو۔ اور جو شخص ایسا کرے گا سو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ اور اللہ کے احکام کے ساتھ کھلواڑ نہ کرو۔ اور جو نعمتیں اللہ کی تم پر ہیں، ان کو یاد کرو اور (خصوصاً) اس کتاب اور حکمت کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے جس کے ذریعہ سے وہ تم کو نصیحت کرتا ہے۔ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرو اور یقین رکھو کہ اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔ اور جب تم عورتوں

www.javedahmadghamidi.com

کو طلاق دے دو پھر وہ اپنی معیاد (عدت) پوری کر لیں تو تم ان کو اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح کر لیں جبکہ وہ قاعدہ کے موافق باہم رضامند ہوں۔ اس بات کی نصیحت تم میں سے ہر اس شخص کو کی جاتی ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ اس نصیحت کو قبول کرنا تمھارے لیے زیادہ صفائی اور زیادہ پاکیزگی کی بات ہے۔ اور اللہ (اس قانون کی حکمت کو) جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔''

ان آیات کی روشنی میں اسلام کے قانون طلاق کی درج ذیل اہم خصوصیات کا علم حاصل ہوتا ہے:

۱۔ اسلام کے قانون طلاق کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں طلاق دینے اور اس کے واقع (Operational) ہونے میں تین ماہ کا فصل[۱] رکھا گیا ہے، اس کے علاوہ شوہر کے حق رجعت کو دو طلاقوں تک محدود کیا گیا ہے جیسا کہ 'الطلاق مرتان ... الخ' کے جملے سے واضح ہے۔ لیکن بہت سے علما و فقہا نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ طلاق دو مجلس یا دو الگ الگ طہر میں دی جائے۔ مولانا مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:

''مرتان کے لفظ میں اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ دو طلاق بیک وقت و بیک لفظ نہ ہوں بلکہ دو طہروں میں الگ الگ ہوں۔ 'الطلاق مرتان' سے بھی دو طلاق کی اجازت ثابت ہو سکتی تھی مگر 'مرتان' ایک ترتیب و تراخی کی طرف مشیر ہے جس سے مستفاد ہوتا ہے کہ دو طلاقیں ہوں تو الگ الگ ہوں۔ مثال سے یوں سمجھیے کہ کوئی شخص کسی کو دو روپے ایک دفعہ دے دے تو اس کو دو مرتبہ دینا نہیں کہتے۔ الفاظ قرآن میں دو مرتبہ دینے کا مقصد یہی ہے کہ الگ الگ طہر میں دو طلاقیں دی جائیں[۲]۔'' (معارف القرآن ۱/۵۶۰)

اس سلسلے میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں:

''ایک ہی دفعہ دو طلاقیں دے دینی مکروہ ہیں، کیونکہ 'مرتان' کا لفظ تفریق پر دلالت کرتا ہے اور اشارۃً عدد پر۔ اور ('الطلاق' میں) لام جنس کے لیے ہے۔ پس قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ اکٹھی دو طلاقیں معتبر نہ ہوں اور جب دو طلاقیں معتبر نہ ہوئیں تو تین اکٹھی دینی تو بدرجۂ اولیٰ معتبر نہ ہوں گی، کیونکہ تین میں دو سے زیادہ زیادتی ہے۔''

---

۱ (ثلاثہ قروء۔ البقرہ ۲:۲۲۸)

۲ مزید دیکھیے، روح المعانی، ۱/۱۳۶۔

(تفسیر مظہری، قاضی ثناء اللہ پانی پتی ۱/۳۰۰)

لیکن راقم کو اس تشریح سے اتفاق نہیں ہے۔ 'الطلاق مرتان' سے دو الگ الگ مجلس یا طہر میں طلاق دینا مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے دو ایسی رجعی طلاقیں مراد ہیں جن کے دینے کا اختیار ایک مرد کو اپنی پوری ازدواجی زندگی میں حاصل ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک مرتبہ حالت طہر میں طلاق دے اور عدت کے اندر رجوع کر لے پھر آگے چل کر کسی سبب سے دوسری مرتبہ طلاق دے اور پھر عدت کے اندر رجوع کر لے۔ اس کے بعد اگر اس نے کسی موقع پر تیسری طلاق دے دی تو اب اس کا حق رجوع ساقط ہو گیا اور عورت اس سے جدا ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ 'الطلاق مرتان' سے تعداد طلاق کی تحدید بھی مقصود ہے جو ایام جاہلیت اور شروع اسلام میں غیر محدود تھی۔ عروہ بن زبیر سے روایت ہے کہ ابتدائے اسلام میں لوگوں کی حالت یہ تھی کہ بے حد و حساب طلاقیں دیتے تھے۔ کوئی یہ کرتا کہ بیوی کو طلاق دے دی اور جب اس کی عدت ختم ہونے کے قریب آئی تو رجوع کر لیا پھر اسی طرح طلاق دے دی محض بیوی کو ستانے کی غرض سے۔ اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ 'الطلاق مرتان'[۳]۔

ہم نے اوپر 'الطلاق مرتان' کا جو مفہوم بیان کیا ہے، اس کی تائید مشہور صحابی حضرت رکانہ کے طرز عمل سے ہوتی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں ان کی طلاق کا واقعہ مذکور ہے۔ اہل حدیث کا مسلک اسی روایت پر ہے اور اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی کو پہلی طلاق عہد نبوی میں دی، دوسری طلاق عہد فاروقی میں اور تیسری طلاق عہد عثمانی میں دے کر بیوی کو چھوڑ دیا[۴]۔ یہی مطلب ہے 'الطلاق مرتان ...فان طلقها...' کا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

قرآن مجید نے ہر اس زیادتی کا تدارک کیا جو اہل عرب کی ازدواجی زندگی میں عورتوں کے ساتھ روا رکھی جاتی تھی۔ عربوں میں طلاق کی ایک شکل ایلاء تھی۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ایلاء اہل جاہلیت کی طلاق تھی۔ سعید بن مسیّب فرماتے ہیں کہ ایلاء اہل جاہلیت کا ستانا تھا۔ جب کسی کو اپنی بیوی سے محبت نہیں ہوتی تھی اور وہ یہ بھی نہ چاہتا کہ کوئی دوسرا اس سے نکاح کرے تو وہ یہ قسم کھا لیتا کہ میں کبھی اس کے نزدیک نہ جاؤں گا۔ اس کو اس طرح چھوڑے رکھتا کہ وہ نہ مطلقہ ہوتی اور نہ خاوند والی۔ شروع اسلام میں بھی اس طلاق کا رواج تھا۔ پھر اسلام نے اس کی مدت متعین کی[۵]۔

۳۔ تفسیر مظہری ۱/۳۰۰۔

۴۔ تفسیر مظہری ۱/۳۰۳ (رواہ ابوداوٗد)۔

۵۔ تفسیر مظہری ۱/۲۹۱۔

قرآن مجید نے اس نوع کی طلاق کی جو مدت متعین کی، وہ چار ماہ ہے۔حکم دیا کہ شوہر اس مدت کے اندر رجوع کر لے ورنہ طلاق دے۔اس طلاق کو طلاق رجعی کے درجہ میں رکھا گیا ہے۔دار قطنی نے اسحاق سے جو روایت نقل کی ہے، اس میں حضرت عمر کا قول ہے کہ جب چار مہینے گزر جائیں تو وہ ایک ہی طلاق ہے اور وہ طلاق والی عورت کی طرح عدت پوری کرے۔

اس نوع کی طلاق میں بھی جو حد درجہ تکلیف دہ طلاق ہے، شوہر کے حق رجوع کو باقی رکھا گیا ہے[6]۔ معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں صحیح اور پسندیدہ طلاق وہ ہے جس میں عدت کے ساتھ رجعت کا دروازہ کھلا ہو۔

۲۔اسلام کے قانون طلاق کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جس طرح مرد کو طلاق کا حق ہے اسی طرح عورت کو بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ مہر کی رقم دے کر شوہر سے آزادی حاصل کر لے[7]۔اس کو اصطلاح فقہ میں خلع کہا جاتا ہے۔

۳۔تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اگر شوہر عدت کے اندر رجوع نہ کرے، لیکن بعد میں بیوی کو واپس لینا چاہے اور عورت بھی راضی ہو تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔اس سلسلے میں عورت کے گھر والوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ رجعت کے اس عمل میں مانع نہ ہوں[8]۔اس سے بالکل ظاہر ہے کہ رجعت اسلام کی نظر میں ایک نہایت پسندیدہ امر ہے۔ان علماے کرام کی عقلوں پر رونا آتا ہے جو منشاے قرآن کے خلاف زوجین کو ملنے سے روکتے ہیں، محض اس بنا پر کہ نادان شوہر کے منہ سے غصے میں یا جہالت کی وجہ سے تین طلاق کے الفاظ نکل گئے۔

۴۔اسلام کے قانون طلاق کی چوتھی اہم خصوصیت یہ ہے کہ طلاق رجعی کے بعد عورت کو گھر سے نکالنا ممنوع ہے، البتہ یہ کہ اس نے کوئی بے حیائی کا کام کیا ہو۔

۵۔پانچویں اہم خصوصیت یہ ہے کہ عدت مکمل ہونے پر، خواہ عورت کو واپس لیا جائے اور خواہ رخصت کیا جائے، یعنی طلاق کا عمل واقع ہو جائے، دونوں صورتوں میں دو معتبر گواہوں کی گواہی ضروری ہے۔موخر الذکر دو اہم خصوصیات کا ذکر سورۂ طلاق میں ان لفظوں میں آیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ ''اے نبی (تم لوگوں سے کہہ دو کہ) جب تم لوگ

---

[6] البقرہ۲:۲۲۶۔

[7] فیما افتدت بہ... الخ۔البقرہ۲:۲۲۹۔

[8] البقرہ۲:۲۳۲۔

لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنْ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ لَا تَدْرِي لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَّأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ. (الطلاق ۶۵: ۱۔۲)

عورتوں کو طلاق دو تو عدت کے وقت میں (یعنی طہر میں) طلاق دو اور عدت کو یاد رکھو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو جو تمھارا آقا اور حاکم ہے۔ ان عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں بجز اس کے کہ وہ بے حیائی کی مرتکب ہوں۔ یہ خدا کے مقرر کیے ہوئے ضابطے ہیں۔ اور جو شخص ضوابط خداوندی سے تجاوز کرے گا تو اس نے خود اپنا ہی نقصان کیا۔ تم کو خبر نہیں شاید اللہ تعالیٰ اس (طلاق) کے بعد (ملاپ کی) کوئی صورت پیدا کر دے۔ پھر جب وہ عورتیں اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو خواہ تم ان کو قاعدہ کے موافق روک لو یا قاعدہ کے موافق ان کو رخصت کر دو۔ اور اپنے میں سے دو معتبر گواہوں کو اس پر گواہ کر لو اور (اے گواہو، اگر گواہی کی حاجت پڑے تو) کسی رو رعایت کے بغیر ٹھیک ٹھیک گواہی دو۔‘‘

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

آج کل مسلمانوں میں جس قسم کی طلاق کا رواج ہے، اس میں قرآن کے قانون طلاق کے مذکورہ تمام پہلوؤں کی کھلی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ پھر بھی ان کا دعویٰ ہے کہ وہ اللہ کی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ خرابی صرف تین طلاقوں تک محدود نہیں ہے، بلکہ پورا مسلم معاشرہ غیر اسلامی رسوم ورواج سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں اس کا موقع ومحل نہیں کہ ان سماجی خرابیوں کو بیان کیا جائے۔ لیکن تین طلاقوں کی جو خرابی علما کے غلط فتووں کی وجہ سے مسلم سماج میں سرایت کر گئی ہے، اس کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔ اس خرابی نے ہزاروں معصوم عورتوں اور بچوں کی زندگیوں کو تباہ کیا ہے اور ان کے مستقبل کو تاریک بنایا ہے۔

طلاق ثلاثہ (تین طلاقیں)

فقہاے احناف کہتے ہیں کہ اگر کسی عورت کو اس کے شوہر نے ایک ہی مجلس میں بیک وقت تین طلاقیں (طلاق ثلاثہ) دے دیں تو وہ واقع ہو جائیں گی یعنی طلاق بائن اور اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی۔ اور بغیر نکاح ثانی (حلالہ)

کے وہ اس کے لیے حلال نہ ہوگی۔ یہ فقہ حنفی کا معروف مسلک ہے اور عرصۂ دراز سے بہت سے مسلم ملکوں میں رائج ہے۔لیکن اہل حدیث کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک ہی طلاق سمجھا جائے گا اور شوہر کو عدت کے اندر حق رجوع حاصل ہوگا۔امامیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔راقم کے نزدیک یہی مسلک درست ہے، اول الذکر مسلک سراسر خلاف قرآن ہے۔اس پر تفصیلی گفتگو آگے آرہی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، تین طلاقوں کا تعلق ازدواجی زندگی کے تین مختلف زمانوں سے ہے۔انھی تین متفرق طلاقوں کو عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں بعض صحابہ نے غلطی سے جمع کر لیا۔انھوں نے سمجھا کہ ان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ، خواہ تین طلاقوں کو تین الگ الگ وقتوں میں دیں اور خواہ ان کو جمع کر کے ایک ہی وقت میں دے دیں۔ظاہر ہے کہ ان کی یہ تاویل منشاے قرآن کے خلاف تھی۔امام نسائی بہ روایت محمود بن لبید نقل فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک آدمی کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دی تھیں۔ آپ غصہ میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا: کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جاتا ہے حالانکہ میں تمھارے درمیان موجود ہوں۔یہ سنتے ہی ایک شخص کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا، اے اللہ کے رسول، کیا میں اس کو قتل نہ کر دوں ’الا اقتلہ‘[9]۔

لیکن آپ کی اس ناراضی کے باوجود بہت سے صحابہ غصہ میں اپنی بیویوں کو ایک ہی وقت میں تین اور بسا اوقات اس سے زیادہ طلاقیں دے ڈالتے اور پھر غصہ ٹھنڈا ہونے پر افسوس کرتے۔آگے چل کر اس غلط طریقۂ طلاق کا کثرت سے رواج ہو گیا اور آج تک یہ غیر شرعی طریقۂ طلاق مسلم معاشرہ میں رائج ہے۔

اس سلسلے میں جو روایتیں ہم تک پہنچی ہیں، ان کے تحقیقی جائزہ سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس طرح کی جو طلاقیں دی گئیں، ان میں آپ کا طرز عمل مختلف تھا۔اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین ہو جاتا کہ تین طلاقیں وقتی اشتعال میں آ کر دی گئی ہیں اور طلاق دینے والے کی نیت بیوی کو چھوڑنے کی نہیں تھی تو اس طلاق کو طلاق رجعی قرار دیتے اور شوہر کو رجوع کا حکم صادر فرماتے۔اور جب یہ یقین ہو جاتا کہ طلاق دینے والے کی نیت بیوی کو چھوڑنے کی تھی تو طرفین میں تفریق کرا دیتے۔

دونوں فیصلوں کی نظیریں کتب حدیث میں موجود ہیں۔اول الذکر فیصلہ کی بہترین نظیر حضرت رکانہ کی طلاق ہے۔اس طلاق کا ذکر حدیث کی مختلف کتابوں، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دارمی میں مختلف سندوں کے ساتھ آیا ہے۔اکثر ارباب علم نے امام داؤد کی روایت کو جس میں ’البتتہ‘ کا لفظ ہے، صحیح قرار دیا ہے۔یہ لفظ عربوں کی بول چال

---

9 نسائی، کتاب الطلاق ۲/ ۹۸۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

میں تین طلاقوں کے لیے کثیر الاستعمال تھا، لیکن تین اس کا صریح مفہوم نہ تھا۔ اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت رکانہ کی طلاق کو رجعی قرار دیا۔ لیکن اس سلسلے میں امام ابن تیمیہ کی تحقیق یہ ہے کہ ابو داؤد کی سند میں بعض مجہول راوی ہیں جن کی تضعیف امام بخاری اور دوسرے محدثین نے کی ہے۔ اس بنا پر ابن تیمیہ نے امام احمد بن حنبل کی مسند میں مروی روایت کو باعتبار سند زیادہ قوی بتایا ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے۔ روایت اس طرح ہے:

''ابن عباس نے روایت کی ہے کہ رکانہ نے اپنی بیوی کو ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے دیں۔ اس پر ان کو شدید رنج ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا، تم نے کس طرح طلاق دی تھی۔ انھوں نے کہا کہ تین طلاق۔ پھر پوچھا کہ ایک ہی مجلس میں؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ ایک ہی طلاق ہے، اگر تم چاہو تو رجوع کر سکتے ہو۔ چنانچہ رکانہ نے رجوع کر لیا[10]۔''

دوسری طلاق کی مثال حضرت عویمر عجلانی کی ہے جنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا اور پھر کہا: اللہ کے رسول میں اس پر جھوٹ بولنے والا ہوں گا اگر میں نے اس کو اپنے پاس رکھ لیا، اور پھر عویمر نے اس کو تین طلاقیں دیں قبل اس کے کہ رسول اللہ ان کو حکم دیتے[11]۔

حضرت ابوذر نے اس واقعہ کو حضرت سہل بن سعد کے حوالے سے نقل کرنے کے بعد فرمایا:

''تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نافذ فرمایا۔ اور رسول اللہ کے سامنے جو کچھ پیش آیا، وہ سنت قرار پایا۔ سعد فرماتے ہیں کہ اس موقع پر میں رسول اللہ کے پاس حاضر تھا۔ پس اس کے بعد لعان کرنے والوں کے بارے میں یہ سنت رائج ہوگئی کہ ان کے درمیان تفریق کرا دی جائے اور پھر وہ کبھی جمع نہ ہوں[12]۔''

دونوں واقعات میں طلاق کا فرق بالکل واضح ہے۔ آخر الذکر واقعہ کی شدت کا اظہار اس بات سے ہوتا ہے کہ حضرت عویمر نے رسول اللہ کے سامنے اپنی بیوی سے لعان کیا اور پھر طلاق دے دی۔ اس طرز عمل سے صاف عیاں ہے کہ صحابی مذکور اپنی بیوی سے حد درجہ نالاں تھے اور وہ کسی قیمت پر اس کو اپنے پاس رکھنے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں تفریق کرا دی۔ لیکن حضرت رکانہ کے معاملے میں اس سے بالکل مختلف طرز عمل اپنایا۔ ان کے رنج و صدمہ کو دیکھ کر آپ سمجھ گئے کہ انھوں نے تین طلاقیں شدت غضب سے مغلوب ہو کر دے دی تھیں۔ اس سے مقصود بیوی سے دائمی ترک تعلق نہ تھا۔ چنانچہ آپ نے ان کے حق میں رجوع کا فیصلہ دیا۔

10؎ مسند احمد، امام احمد بن حنبل ۱/۲۶۵۔ (اخرجه البیهقی عن ابن عباس)۔

11؎ صحیح مسلم ۱/۴۸۹۔

12؎ سنن ابی داؤد ۳۰۶۔

ان دونوں واقعات طلاق سے یہ فقہی اصول مستنبط ہوا کہ فتویٰ محض واقعے کی ظاہری صورت کو دیکھ کر نہیں دینا چاہیے، بلکہ ان احوال وکوائف کا مطالعہ ضروری ہے جن کے زیر اثر فعل طلاق واقع ہوا ہے۔

اس فقہی اصول کو پیش نظر رکھیں تو اس روایت کا مفہوم بالکل واضح ہو جاتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں، حضرت ابوبکر صدیق کے عہد خلافت میں اور حضرت عمر کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں طلاق کے بارے میں یہ دستور تھا کہ تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا تو حضرت عمر نے فرمایا کہ لوگ اس معاملہ میں جلد بازی سے کام لینے لگے ہیں جس میں ان کے لیے مہلت تھی اس لیے مناسب ہوگا اگر ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں تو آپ نے نافذ کر دیا۔[۱۳]

عہد رسالت میں طلاق دینے والے کی نیت کا لحاظ کر کے طلاق ثلاثہ کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا تھا۔ یہی طرز معاملہ خلیفۂ اول کے دور حکومت میں رہا اور حضرت عمر فاروق کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں بھی اسی سنت پر عمل رہا جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آج کے حالات میں طلاق دینے والے کی نیت کا لحاظ نہ کیا جائے۔ اگر شوہر حلفاً یہ بیان دے کہ تین طلاقوں سے اس کی نیت بیوی کو چھوڑنے کی نہیں تھی محض غصے میں تین کے الفاظ منہ سے نکل گئے تو اس طلاق کو طلاق رجعی قرار دیا جانا چاہیے، کیونکہ اسلام کے قانون طلاق کا منشا یہ ہے کہ جب زوجین ملنا چاہیں تو ان کو ملنے دیا جائے۔ لیکن اگر تحقیق کے بعد یہ معلوم ہو کہ شوہر نے طلاق کسی وقتی جذبے سے مغلوب ہو کر نہیں دی ہے، بلکہ یہ اس کا خوب سوچا سمجھا فیصلہ ہے اور وہ بیوی کو واپس لینے کے لیے بالکل آمادہ نہیں ہے تو پھر تفریق کرا دی جائے بشرطیکہ وہ ان تمام واجبات کو ادا کرنے کے لیے تیار ہو جو بیوی سے ترک تعلق کی صورت میں اس پر شرعاً واجب ہوتے ہیں۔

جہاں تک حضرت عمر فاروق کے فیصلے کا تعلق ہے تو وہ ایک وقتی اجتہاد تھا اور اس دور کے مخصوص حالات و مسائل کے عین مطابق تھا، اور حاکم کو اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اس فیصلہ سے اس وقت کسی صحابی نے بھی اختلاف نہیں کیا۔ امام طحاوی لکھتے ہیں:

> ''پس حضرت عمر نے اس کے ساتھ لوگوں کو مخاطب فرمایا۔ ان لوگوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابہ بھی تھے جن کو اس سے پہلے رسول کریم کے زمانے کے طریقے کا علم تھا تو ان میں سے کسی نے انکار نہیں کیا اور نہ اسے رد کیا۔''[۱۴]

۱۳؎ صحیح مسلم ۱/۴۷۷، ابوداؤد، نسائی، حاکم و بیہقی عن ابن عباس۔

۱۴؎ شرح معانی الآثار ۲/۲۹۔

www.javedahmadghamidi.com

وہ روایتیں (آثار صحابہ) جن میں تین طلاقوں کو طلاق بائن بتایا گیا ہے، ان کا تعلق اسی دور سے ہے۔ حضرت عمر فاروق کے مذکورہ اجتہاد کو جسے بعض اہل علم نے تعزیری فیصلہ بتایا ہے، اسلام کے اصل قانون طلاق کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ موجودہ حالات کا تقاضا ہے کہ عہد نبوی کے فیصلہ کو اختیار کیا جائے تاکہ ہزاروں مسلم خاندانوں کو تباہی سے بچایا جاسکے۔ یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ عہد نبوی اور خلافت راشدہ، دونوں میں مسلمانوں کو سیاسی اقتدار حاصل تھا۔ اس کے علاوہ ان کے معاشرہ میں مطلقہ اور بیوہ عورتوں کا نکاح ثانی آسانی کے ساتھ ہو جاتا تھا۔ وہ مطلقہ عورتیں جن کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا، ان کی کفالت اور خبر گیری ریاست کی ذمہ داری تھی۔ اس وقت یہ سب حالات عنقا ہیں، اس لیے حضرت عمر کے اجتہادی فیصلے کو طلاق ثلاثہ کے واقع ہو جانے کے حق میں بطور دلیل پیش کرنا دلیل کم نظری ہے۔ ہر فتویٰ کو اس کے مخصوص ماحول میں رکھ کر دیکھنا چاہیے۔

صحیح طریقۂ طلاق

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اسلام نے طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ بتایا ہے کہ عورت کو حالت طہر میں مقاربت کے بغیر ایک طلاق دے کر چھوڑ دیا جائے۔ عدت گزرنے کے بعد طلاق خود بخود واقع ہو جائے گی۔ عدت گزرنے سے پہلے شوہر کو حق حاصل ہے کہ وہ رجوع کر لے۔ عدت کے بعد نکاح ثانی کی صورت میں عورت کو واپس لیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ واپسی کے لیے تیار ہو۔

ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ جب آدمی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور ہو جائے تو ایک طلاق دے دے۔ اگر رجعت کا ارادہ نہ ہو تو اسے ویسے ہی رہنے دے یہاں تک کہ عدت پوری ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں طلاق سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز ہے 'ابغض الحلال الی اللّٰہ الطلاق[15]'۔

بہت سے نیم خواندہ مسلمان سمجھتے ہیں کہ جب تک تین بار طلاق کے الفاظ نہ کہے جائیں تو طلاق واقع ہی نہیں ہوتی۔ اس غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ جب ایک بار کہہ دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے تو پھر الفاظ طلاق کی تکرار بے سود ہے اور اس سے نفس واقعہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ الفاظ طلاق کی تکرار بالعموم طلاق کو موکد کرنے کی غرض سے ہوتی ہے یا شوہر غصہ کی حالت میں مشتعل ہو کر تعداد طلاق کو بڑھا دیتا ہے۔ مثلاً یوں کہے کہ میں نے تم کو سو طلاقیں دیں۔ اس فعل سے گو کہ قابل مذمت ہے، طلاق کی نوعیت جوں کی توں قائم رہتی ہے یعنی وہ ایک طلاق رجعی کے حکم

۱۵؎ تفسیر مظہری ۱/۳۰۳ (رواہ ابوداؤد)۔

میں ہوگا۔ اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ بار اس نازیبا حرکت کا مرتکب ہو تو وہ یقیناً سزا کا مستحق ہے۔ حضرت عمر کے بارے میں روایت ہے کہ ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دینے والا کوئی شخص جب ان کے پاس لایا جاتا تو اس کو درے لگاتے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک مجلس یا طہر میں تین طلاقیں دینا خلاف سنت ہے، اور یہ بلا شبہ خلاف سنت ہے، لیکن الگ الگ تین مجلسوں یا طہروں میں طلاق دینا مطابق سنت ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ جس طرح ایک مجلس میں تین طلاقیں دینا خلاف سنت ہے اسی طرح تین الگ الگ مجلسوں یا طہروں میں طلاق دینا بھی خلاف سنت ہے۔ فرق صرف درجے کا ہے۔ اول الذکر طلاق بدعت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے، لیکن ثانی الذکر کو بدعت کے خانہ سے اس لیے نکال دیا گیا ہے کہ اس میں شوہر کے لیے غور و فکر اور رجعت کا موقع باقی رہتا ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ طریقۂ طلاق بھی خلاف سنت ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع نے لکھا ہے:

> ''یہی وجہ ہے کہ امام مالک اور بہت سے دوسرے فقہا نے تیسری طلاق کو جائز نہیں رکھا ہے، اس کو وہ طلاق بدعت کہتے ہیں۔ اور دوسرے فقہا نے تین طلاقوں کو صرف اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ الگ الگ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں۔ ان فقہا کی اصطلاح میں اس کو بھی طلاق سنت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے مگر اس کا یہ مطلب کسی کے نزدیک نہیں ہے کہ اس طرح تین طلاقیں دینا مسنون اور محبوب ہے بلکہ طلاق بدعت کے مقابلے میں اس کو طلاق سنت اس معنی سے کہہ دیا گیا کہ یہ بدعت میں داخل نہیں۔'' (معارف القرآن ۱/۵۵۹)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

سنت کی طرف واپسی

اگر کوئی شخص خلاف سنت طلاق دیتا ہے، مثلاً ایک مجلس میں بیک دفعہ تین طلاقیں دے دے تو ایسے شخص کو تنبیہ کی جائے اور اس کے اس فعل کو کالعدم قرار دے کر اس کو سنت (اصل قانون) کی طرف لوٹایا جائے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اکثر علما و فقہا تسلیم کرتے ہیں کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں طلاق بدعت ہے اور بعض کے نزدیک ناجائز اور حرام، لیکن اس کے باوجود ان کا اصرار ہے کہ وہ واقع ہو جاتی ہیں۔ مولانا مفتی محمد شفیع لکھتے ہیں:

> ''اپنے سارے اختیارات طلاق کو ختم کر کے تین طلاق تک پہنچنا اگرچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی کا سبب ہوا جیسا کہ سابقہ روایت میں لکھا جا چکا ہے۔ اور اسی لیے جمہور امت کے نزدیک یہ فعل غیر مستحسن اور بعض

کے نزدیک ناجائز ہے۔مگران سب باتوں کے باوجود جب کسی نے ایسا کرلیا تو اس کا وہی اثر ہونا چاہیے جو جائز طلاق کا ہوتا یعنی تین طلاقیں واقع ہو جائیں اور رجعت کا اختیار نہ ہو،اور نکاح جدید کا اختیار بھی سلب ہو جائے۔''

(معارف القرآن ۱/ ۵۶۳)

بعض علما نے اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔علامہ زرقانی نے شرح موطا میں لکھا ہے کہ جمہور امت تین طلاقوں کے واقع ہونے پر متفق ہیں، بلکہ ابن عبدالبر کے نزدیک اس پر اجماع ہے اور اگر اس کے خلاف کوئی قول ہے تو اس کی طرف التفات نہیں کیا جائے گا۔[16]

شیخ الاسلام نووی نے لکھا ہے کہ امام شافعی، امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد اور سلف وخلف کے بہت سے علما کا خیال ہے کہ تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔البتہ، طاؤس اور بعض اہل ظاہر کے قول کے مطابق ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے۔[17]

طاؤس اور عکرمہ جیسے ارباب فقہ کا صرف یہی فتویٰ نہیں ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقیں طلاق رجعی کے حکم میں داخل ہیں، بلکہ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ طریقہ خلاف سنت ہے، اس لیے اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو سنت کی طرف لوٹایا جائے۔یہی قول ابن اسحاق کا ہے۔[18]

اس قول کی تائید عبداللہ بن عمر کے واقعۂ طلاق سے ہوتی ہے۔انھوں نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی تھی۔حضرت عمر نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔حضور سنتے ہی غصہ ہو گئے۔پھر فرمایا: اسے چاہیے کہ عورت سے رجوع کر لے یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائے پھر اسے حیض آئے پھر پاک ہو جائے، اس کے بعد اگر طلاق ہی دینی ہے تو حالت طہر میں مقاربت کے بغیر طلاق دے دے۔پس یہی وہ عدت (وقت) ہے جس میں عورتوں کو طلاق دینے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔[19]

اکثر علما وفقہا نے غالباً قانون کے اس پہلو پر غور نہیں کیا اور اگر غور کیا تو کسی سبب سے اس سے صرف نظر کر لیا کہ وضع قانون کا مقصد افراد معاشرہ کے درمیان عدل وقسط کا قیام ہے یعنی ایک فرد دوسرے فرد کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ نہ کرے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس کے لیے 'حدود اللّٰہ' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔گویا قانون

---

۱۶ شرح موطا ۳/ ۱۶۷۔

۱۷ شرح مسلم ۱/ ۴۷۸۔

۱۸ تفسیر مظہری ۱/ ۳۰۱۔

۱۹ متفق علیہ۔

وہ حد مقرر کرتا ہے جس سے تجاوز کرنا افراد معاشرہ کے لیے نقصان کا موجب ہے۔ اسی طرح ہر قانون چاہتا ہے کہ اس کو جوں کا توں نافذ کیا جائے۔ دنیوی حکومتوں میں بھی قانون کا احترام اور اس کی مکمل پیروی لازمی خیال کی جاتی ہے اور اس کی خلاف ورزی موجب سزا ہوتی ہے۔ پھر اسلام کے قانون طلاق کے بارے میں یہ خیال کس طرح قائم کر لیا گیا کہ اس کی مکمل پیروی ضروری نہیں ہے اور اس کی عدم تعمیل قابل مواخذہ نہ ہوگی۔

اس پس منظر میں غور کریں تو تسلیم کریں گے کہ تین طلاق کا موجودہ طریقہ نہ صرف عورت اور اس کے بچوں کے ساتھ زیادتی، بلکہ ظلم صریح کے مترادف ہے۔ تعجب اس پر ہے کہ اس زیادتی کو بچشم سر دیکھنے کے باوجود اس غلط طریقۂ طلاق کے اثرات کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جو مسلمان اسلام کے قانون طلاق کی خلاف ورزی کرتا، اس کو سزا دی جاتی اور اصل قانون کی طرف رجعت کے لیے اس کو مجبور کیا جاتا۔ لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ سزا تو درکنار طلاق ثلاثہ کے پردے میں ان کو موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ عورتوں اور بچوں کی زندگی کے ساتھ کھلواڑ کریں۔

اگر آپ کسی مفتی سے پوچھیں کہ فلاں شخص نے مغرب کی نماز میں تین رکعتوں کے بجائے دو ہی رکعت ادا کی ہیں تو کیا اس کی نماز ہو گئی؟ فوراً جواب ملے گا کہ ہرگز نہیں، وہ خطاکار رہے۔ وہ ہرگز یہ فتویٰ نہ دے گا کہ نماز تو ہو گئی، لیکن یہ نماز بدعت ہے اور مصلی قصوروار رہے۔ اسی طرح اگر کوئی صاحب نصاب مسلمان اپنے مال کی زکوٰۃ مقررہ نصاب سے کم نکالے تو ہر دارالافتا سے ایک ہی فتویٰ صادر ہوگا کہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، اس لیے کہ اس نے اسلام کے قانون زکوٰۃ کی خلاف ورزی کی ہے۔ اگر اسلامی ریاست ہوگی تو اس نالائق کی پشت پر تازیانے پڑیں گے اور اس کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ مقررہ نصاب کے مطابق زکوٰۃ ادا کرے۔

لیکن یہی مفتیان کرام اور علماے عظام اسلام کے قانون طلاق کی خلاف ورزی کے معاملے میں اس سے بالکل مختلف طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ تین طلاقیں دینے والے سے یہ نہیں کہا جاتا کہ تمھاری طلاق واقع نہیں ہوئی اس لیے کہ خلاف قاعدہ دی گئی ہے، تم کو اصل قانون کے مطابق طلاق دینی ہوگی اگر تم فی الواقع اپنی بیوی سے رشتۂ زوجیت کا انقطاع چاہتے ہو۔ اس کے برعکس یہ کہا جاتا ہے کہ طلاق تو واقع ہو گئی مگر تم نے گناہ کا کام کیا۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کی جو دینی اور اخلاقی حالت ہے اور جس نوع کے سیاسی اور معاشی بحران سے ملت دوچار ہے، اس کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے طلاق کے معاملے میں صرف دو متبادل ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو، جس کا آج کل رواج ہے، ایک طلاق رجعی قرار دیا جائے، اور دوسرا متبادل یہ ہے کہ اسے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

کالعدم قرار دے کر طلاق دینے والے سے کہا جائے کہ وہ بیوی کو واپس لے اور سنت کے مطابق حالت طہر میں بغیر جنسی مقاربت کے طلاق دے اور عدت کا خیال رکھے۔ اگر بیوی کو واپس لینا ہے تو عدت کے اندر رجوع کرے ورنہ حسن سلوک کے ساتھ اسے رخصت کر دے۔ اس کے سوا ہر طریقۂ طلاق بدعت و ضلالت ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

پروفیسر خورشید عالم

مسجد اور عورت

امام ابن حزم اندلسی کا مسلک

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۲

۴۔حضرت عائشہ سے مروی حدیث کے نا قابل حجت ہونے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ نئی باتیں ایجاد کرنے کا عمل بلاشک بعض عورتوں سے سرزد ہوتا ہے اور بعض سے نہیں ہوتا۔ یہ محال ہے کہ بعض عورتوں کی بدعت پسندی کی وجہ سے دوسری عورتوں کو کار خیر سے روک دیا جائے۔ ہاں اگر اس سلسلہ میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اللہ کا کوئی حکم نازل ہوتا تو اور بات تھی۔اس کو سنا بھی جاتا اور مانا بھی جاتا، بے شک اللہ کا فرمان ہے:'و لا تکسب کل نفس الا علیھا و لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ'(الانعام ۶:۱۶۴)''کوئی شخص (بدی) نہیں کماتا، مگر اس کا وبال اس پر ہوتا ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔''

۵۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ اگر نئی بات یا نیا کام عورتوں کو مسجد جانے سے روکنے کا سبب ہوتا تو زیادہ موزوں یہ تھا کہ وہ ان کو بازار اور ہر راستے سے روکنے کا سبب بھی بنتا۔ یہ لوگ بدعت پسندی کی وجہ سے عورتوں کو خاص طور پر مسجد جانے سے کیوں روکتے ہیں اور ان کو سب راستوں سے کیوں نہیں روکتے؟ بلکہ ابوحنیفہ نے تو ڈھائی دن کی مسافت پر ان کو اکیلے سفر کرنے اور دشت وصحرا میں سیر وسیاحت کی اجازت مرحمت فرمائی ہے اور اسے مکروہ نہیں سمجھا۔اسی

طرح اختلاط کو بھی مکروہ نہیں سمجھنا چاہیے۔

۶۔چھٹی وجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ کی رائے یہ نہیں تھی کہ ان کو اس وجہ سے روکا جائے اور نہ آپ نے یہ فرمایا کہ ان کو روکو، کیونکہ وہ نئی نئی باتیں پیدا کر رہی ہیں، بلکہ یہ بتایا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہوتے تو ان کو منع کرتے۔ ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ اگر رسول علیہ السلام نے ان کو منع کیا ہوتا تو ہم بھی منع کرتے، جب آپ نے ان کو منع نہیں کیا تو ہم کون ہوتے ہیں ان کو منع کرنے والے۔نتیجتاً ان کا فعل خلاف سنت بھی ہے اور قول عائشہ کے بھی خلاف ہے۔ اپنے پیروکاروں کو اس وہم میں مبتلا کرنا کہ حضرت عائشہ نے اپنے کلام سے عورتوں کو مسجد کی طرف نکلنے سے منع فرمایا ہے، جھوٹ ہے۔آپ نے ایسا نہیں کیا۔کسی کو رسوا کرنے سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

وضاحتی نوٹ: (حضرت عائشہ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ اگر عورت مسجد میں جائے تو ان آداب کی پابندی کرے جو حدیث میں بیان ہوئے ہیں۔یعنی اس نے خوش بو نہ لگائی ہو، بنی ٹھنی نہ ہو۔ان کا قول ان عورتوں کے لیے تنبیہ ہے جو ان آداب کو نظر انداز کرتی ہیں۔امام ابن تیمیہ فتاویٰ (۲۹:۲۹۶) میں فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ کا مقصد مطلقاً عورتوں کو منع کرنا نہ تھا، کیونکہ ہر عورت تو ایسا نہیں کرتی تھی۔ان کا مقصد تو صرف ان کو روکنا تھا جو نئی نئی باتیں کرتی تھیں۔)

رہی عبدالحمید بن منذر سے مروی حدیث وہ ایک مجہول آدمی ہے۔کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کون ہے؟ ایک مجہول آدمی کی روایت کی بنیاد پر ثقہ راویوں کی متواتر روایات کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ جہاں تک عبداللہ بن رجاء غدانی کی روایت کا تعلق ہے تو وہ کثرت سے تحریف اور غلطیاں کرتا ہے۔وہ قابل حجت نہیں۔یہی بات اس کے بارے میں عمرو بن علی الفلاس وغیرہ نے کہی ہے۔پھر اگر یہ حدیث اور عبداللہ بن رجاء غدانی کی حدیث صحیح بھی ہو، حالانکہ وہ صحیح نہیں ہیں تو بھی وہ اپنے متن میں ان ثابت شدہ احادیث سے متصادم ہیں جن کو ہم نے بیان کیا ہے اور اس حکم سے بھی متصادم ہیں، جو رسول علیہ السلام نے خلوت گاہوں میں بیٹھنے والی اور حیض والی عورتوں تک کو نماز عید میں حاضر ہونے کا دیا۔اور حکم دیا کہ جس کسی کے پاس جلباب (چادر یا عبا) نہیں، وہ دوسری عورت سے عید کی نماز کے لیے عاریۃً لے لے۔اور اس حدیث سے بھی متصادم ہے جو ہمارے لیے بیان کی... عبداللہ بن مسعود نے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:'صلاۃ المراۃ فی بیتها افضل من حجرتها و صلا تها فی مسجدها افضل من صلاتها فی بیتها'، ''اپنے گھر میں عورت کی نماز اپنے چھوٹے کمرے میں نماز پڑھنے سے افضل ہے اور اپنی (محلّہ کی مسجد) میں اس کی نماز اپنے گھر میں نماز پڑھنے سے افضل ہے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

امام علی بن حزم کا قول ہے کہ اپنی مسجد سے مراد بلاشبہ محلے کی مسجد ہے۔اس کے علاوہ کوئی اور مسجد ہو نہیں سکتی، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد گھر کی مسجد ہوتی تو آپ یوں فرماتے: اپنے گھر میں نماز پڑھنا اس کے لیے اپنے گھر میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔ایسی فضول اور بے معنی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سے بعید ہے، اگر بات ایسے ہی ہے جیسا کہ ہم نے سمجھا ہے تو صحیح یہ ہے کہ ان دونوں حکموں میں سے ایک حکم منسوخ ہے۔

یا آپ کا یہ فرمان کہ: ''بے شک، عورت کی مسجد میں نماز گھر میں نماز سے افضل ہے'' اور آپ کا عورتوں کو عید اور مسجد کی طرف نکلنے کی ترغیب دینا آپ کے اس قول سے منسوخ ہے کہ: ''عورت کی گھر میں نماز مسجد میں نماز سے بہتر ہے اور اپنی مسجد میں نماز عید کے لیے باہر نکلنے سے بہتر ہے۔'' یا آپ کا یہ فرمان کہ: بے شک، عورت کی گھر میں نماز اپنی مسجد کی نماز سے بہتر ہے اور اپنی مسجد میں نماز عید کے لیے باہر نکلنے سے بہتر ہے۔'' آپ کے اس قول سے منسوخ ہے کہ: ''بے شک عورت کی اپنی مسجد میں نماز گھر میں پڑھنے سے افضل ہے اور نماز عید کے لیے عورتوں کو نکلنے کی جو ترغیب آپ نے دی ہے وہ بہتر ہے۔''

ان دونوں صورتوں میں سے ایک صورت تو لازماً ہوگی۔خبر صحیح کو کسی دلیل کے بغیر یقینی طور پر منسوخ قرار دینا روا نہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہم نے اس مسئلہ پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ مسجد اور عید گاہ کی طرف عورتوں کا خروج ادائیگی نماز کے علاوہ ایک زائد عمل ہے۔سحر خیزی، تاریکی، بھیڑ بھاڑ، تپتی ہوئی دوپہر، بارش اور سردی کی کلفت اس پر مستزاد ہے، اگر اس عمل زائد کی فضیلت منسوخ ہوتی تو دونوں میں سے ایک صورت ہوتی اور کوئی تیسری صورت ممکن نہیں یا تو مسجد اور عید گاہ میں عورت کی نماز گھر میں نماز کے مساوی ہوتی۔اس صورت میں یہ سارا زائد عمل لغو اور باطل ٹھہرتا اور محض تکلف اور تھکان ہوتا۔اس کے علاوہ اس کی کوئی اور شکل نہ ہوتی، مگر مخالفین بھی اس کا دعویٰ نہیں کرتے یا پھر جیسا کہ مخالفین کا قول ہے کہ مسجدوں اور عید گاہ میں نماز ان کی گھروں میں نماز سے کم فضیلت والی ہوگی۔اس صورت میں سارے کا سارا مذکورہ عمل لازمی طور پر گناہ ہوگا، جو فضیلت کو کم کرتا ہے۔کیونکہ جو زائد عمل ایک نماز کی فضیلت کو بالکل اس جیسی نماز سے کم کر دے، وہ حرام ہی تصور ہوگا۔اس کے علاوہ اور کسی تصور کا امکان نہیں۔اس مسئلہ کو نماز میں مستحب اعمال کے ترک کرنے پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ان مستحب اعمال کو کرنے سے اجر کم نہیں ہوتا۔ان کا چھوڑنا گناہ کا باعث نہیں بنتا، بلکہ اس کا مطلب چند نیک کاموں کو چھوڑنا ہے، جبکہ ایسا کام جس کا کرنے والا مشقت اٹھاتا ہے اور جو اس کے اس اجر کو تلف اور ضائع کر دیتا ہے جو اس کام کے نہ کرنے سے اسے ملتا، بلاشبہ حرام ہے۔اس کے علاوہ

اس کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ کراہت میں تو اصلاً کوئی گناہ نہیں اور نہ اس میں عمل کا ضیاع ہے اس میں تو اجر کا حاصل نہ ہونا اور وبال کا پڑنا ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔ گناہ فقط اس صورت میں ہوگا جب کسی عمل کو حرام سمجھ کر ضائع کر دیا جائے۔

زمین پر بسنے والے سب لوگ (مسلمان) اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات تک عورتوں کو اپنے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے سے کبھی منع نہیں فرمایا اور نہ ان کے بعد خلفاے راشدین نے ایسا کیا۔ درست بات یہی ہے کہ یہ ایک غیر منسوخ عمل ہے۔ یہ بلا شبہ ایک نیک کام ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول علیہ السلام اسے برقرار نہ رکھتے اور عورتوں کو اس حالت میں نہ چھوڑتے کہ وہ بغیر کسی فائدے کے، بلکہ الٹا نقصان کی خاطر تکلیف اٹھاتی رہیں۔ یہ تو تنگی اور اذیت ہے نہ کہ خیر خواہی اور ہمدردی۔ جب یہ بات یقینی ہے تو حکم (مسجد میں عورتوں کے جانے کا) ناسخ ہے اور دوسرا حکم (منع کرنے کا) منسوخ ہے۔ یہ تو اس صورت میں ہے اگر مذکورہ دونوں حدیثیں صحیح مان لی جائیں، لیکن ان دونوں احادیث کے غیر صحیح ہونے کی وجہ سے کیا صورت بنے گی؟

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہم نے عبد الرزاق کی سند سے سفیان ثوری سے اور انھوں نے ہشام بن عروہ سے روایت کی ہے کہ عمر بن الخطاب نے سلیمان بن ابی حثمہ کو حکم دیا کہ وہ رمضان کے مہینے میں مسجد کے پچھلے حصے میں عورتوں کی امامت کریں۔ عبد الرزاق نے معمر سے اور انھوں نے زہری سے روایت کی ہے کہ عاتکہ بنت زین بن عمرو بن نفیل حضرت عمر بن الخطاب کی بیوی تھیں۔ وہ نماز کے لیے مسجد میں حاضر ہوا کرتی تھیں۔ حضرت عمر انھیں کہا کرتے۔ بخدا تو جانتی ہے کہ میں اسے پسند نہیں کرتا تو وہ جواب دیتیں کہ میں اس وقت تک نہیں رکوں گی جب تک آپ مجھے منع نہیں کریں گے۔ جس دن حضرت عمر کو خنجر لگا وہ مسجد میں تھیں۔

امام علی بن حزم کا قول ہے کہ اگر امیر المومنین کو علم ہوتا کہ مسجد میں نماز پڑھنے سے بیوی کو کوئی اجر نہیں ملے گا تو وہ انھیں منع کرنے سے کبھی باز نہ آتے۔ اور اگر انھیں علم ہوتا کہ یہ عمل ان کے اجر کو کم کرتا ہے یا اسے ضائع کرتا ہے۔ تو پھر کیا کیفیت ہوتی؟ آپ کے اس قول میں کہ ''میں اسے ناپسند کرتا ہوں'' ان کے لیے کوئی دلیل نہیں۔ کیونکہ نفسی میلان میں کوئی گناہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ہر مسلمان اگر اسے اللہ کا خوف نہ ہو، رمضان میں بھوک پیاس کی حالت میں کھانا پینا پسند کرتا ہے اور چھوٹی راتوں کی ٹھنڈی صبحوں میں نیند چھوڑ کر نماز کے لیے اٹھنا پسند نہیں کرتا اور انسان ہر خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر ملاقات چاہتا ہے۔ چنانچہ آدمی اگر ممنوع چیز کو پسند کرے تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ اپنے دل کو رغبت سے موڑنا اس کے بس میں نہیں، اصل اہمیت تو اس کے صبر اور اس کے عمل کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد

ہے:'کتب علیکم القتال وھو کرہ وعسی ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم وعسی ان تحبوا شیئا وھو شر لکم '(البقرہ۲:۲۱۶)''تم پر قتال فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو ناگوار ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو ناگوار ہو اور وہ تمھارے لیے اچھی ہو اور ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو۔''

عبدالرزاق کی سند سے محمد بن عمارہ نے عمرو الثقفی اور اس نے عرفجہ سے روایت کی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب لوگوں کو رمضان میں قیام لیل کا حکم دیتے تھے۔ پس وہ ایک امام مردوں کے لیے اور ایک امام عورتوں کے لیے مقرر کرتے۔ پس آپ نے مجھے عورتوں کی امامت کا حکم دیا تو میں نے ان کی امامت کی۔

امام علی بن حزم کا قول ہے کہ جوان اور بوڑھی عورتیں (مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے) برابر ہیں۔

بے محل نہ ہوگا اگر 'المحلی' کی اس بحث کے آخر میں عصر حاضر کے عالم جامعۂ اسلامیہ مدینہ منورہ کے استاد اور شاہ فیصل ایوارڈ یافتہ شیخ محمد غزالی مرحوم کی کتاب 'السنۃ النبویۃ بین اھل الفقہ و اھل الحدیث' کا اقتباس پیش کر دیا جائے۔ جو اس مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔ شیخ محمد غزالی فرماتے ہیں:

> ''نماز با جماعت اسلام کا ایک شعار ہے۔ جب سے اسلامی معاشرہ قائم ہوا مسجد اسلامی سرگرمیوں کا مرکز اور مسلمانوں کے مل بیٹھنے کی جگہ ہے، جہاں پر محبت اور تعاون کے جذبے کے ساتھ چہرے سے چہرہ اور ہاتھ سے ہاتھ آپس میں ملتے ہیں۔''(۶۰۔۶۴)

مومن قدم سے قدم اور شانے سے شانہ ملا کر اللہ تعالیٰ کے سامنے باہم پیوستہ صفوں میں کھڑے ہوتے ہیں۔ ('اقیموا الصلٰوۃ 'میں مردوں اور عورتوں، سب کو اقامت صلوٰۃ کا حکم ہے اور نماز با جماعت اقامت کا اہم جز ہے۔) خشوع وخضوع سے قرآن کی سماعت اور رکوع وسجود میں تسبیح وتحمید انھیں سنوارتی ہے۔

نماز کی فکری اور اخلاقی تاثیر خاصی گہری ہے۔ قرآن کی تلاوت معیار کو بلند کرتی ہے اور تقویٰ پیدا کرتی ہے اور بار بار کی ملاقات خاص اور عام تعلقات کی محافظ ہوتی ہے۔ نماز سے مسلم امہ اس قابل ہو جاتی ہے کہ وہ آج اور کل کا سامنا باہم آشنا بن کر کرے نہ کہ اجنبی بن کر۔ اسی وجہ سے نماز با جماعت کو دین کی علامت ٹھہرایا گیا ہے۔ بعض فقہا کی رائے ہے کہ پانچوں نمازیں با جماعت پڑھنا فرض ہے جو صحیح عذر کے بغیر ساقط نہیں ہوتا، لیکن جمہور علما کا قول ہے کہ نماز با جماعت سنت موکدہ ہے۔

کیا نماز مرد اور عورت، دونوں کے لیے سنت موکدہ ہے؟ ظاہری فقہ کے علما کی یہی رائے ہے۔ لیکن اس پر غور و فکر کی ضرورت ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

صحیح سنت میں وارد ہے کہ عورت اپنے گھر کی نگہبان ہے اور وہ اپنے زیرنگرانی افراد کے لیے جواب دہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اولاد کے معاملات خاص طور پر شیر خوارگی اور کام کاج سے لوٹنے والے مرد کے استقبال کی تیاری، عورت کے لیے باجماعت نماز پنج گانہ کی پابندی کے راستے میں حائل ہے۔ اس لیے ہماری رائے یہ ہے کہ اس کے لیے باجماعت نماز میں حاضری اس وقت مطلوب ہے جب وہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہو جائے۔ جب وہ اپنے فرائض سرانجام دے لے تو پھر اس کے خاوند کے لیے جائز نہیں کہ وہ اسے مسجد میں جانے سے روکے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے: ''تم اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں جانے سے نہ روکو۔'' ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے مسجد نبوی کا ایک دروازہ عورتوں کے لیے مخصوص کر رکھا تھا اور آپ نے انھیں مسجد کی پچھلی صفوں میں کھڑا ہونے کی ہدایت کی تھی، کیونکہ یہ بات رکوع وسجود میں ان کے لیے محفوظ تر تھی اور آپ نے ان مردوں کو ڈانٹ ڈپٹ کی جوان کی صفوں سے قریب ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح آپ نے ان عورتوں کو بھی ڈانٹ ڈپٹ کی جو مردوں کی صفوں سے قریب ہونے کی کوشش کرتی تھیں۔ مسجد میں عورتوں کی صفیں عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے دور میں برقرار رہیں۔ اس بنا پر کسی ہنگامہ کرنے والے نے کوئی ہنگامہ نہیں کیا، یہ صفیں نماز فجر سے شروع ہو کر عشا تک چلتی تھیں۔

اکثر اوقات رمضان میں تراویح کے لیے عورتوں کی بھرپور جماعت ہوتی تھی۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ نماز عید اور خطبہ کی سماعت میں ان کی شرکت اسلام کا ایک شعار ہے۔ لیکن عالم نسواں کی ترقی کا جو پودا اسلام نے لگایا تھا وہ اب مرجھا کر سوکھنے لگا ہے۔ عورتوں کو کتابت کی تعلیم سے روکنے کے لیے حدیث وضع کی گئی تاکہ وہ پہلے کی طرح ان پڑھ رہیں۔ اس جہالت کا فائدہ کسے ہے؟

جب امت کے نصف حصے پر جہالت اور بے بصری ٹھونس دی جائے تو آنے والی نسلوں کی نشو ونما کیسے ہوگی؟

پھر ایک اور حدیث کا چرچا ہوا جو عورتوں کو تمام نمازیں باجماعت ادا کرنے سے روکتی ہے، بلکہ ان سے مطالبہ کرتی ہے کہ جب وہ گھر میں نماز پڑھنا چاہیں تو وحشت زدہ اور الگ تھلگ جگہ منتخب کریں، کیونکہ تہ خانے میں اس کی نماز کمرے میں پڑھنے سے افضل ہے اور تاریکی میں اس کی نماز روشنی میں پڑھنے سے افضل ہے۔

اس حدیث کا راوی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی سنت متواترہ کو پس پشت ڈال رہا ہے۔

وہ نماز پڑھنے والی عورت کو باعث اذیت سمجھتا ہے اور اسے تنگ ترین اور بعید ترین جگہ میں قید کرنا ضروری گردانتا ہے۔ آیئے ہم اس غریب حدیث کو پڑھیں جس کا ذکر ابن خزیمہ وغیرہ نے کیا ہے۔

''ام حمید ابوحمید ساعدی کی زوجہ نے روایت کی کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئیں اور کہا: اے اللہ کے رسول میں آپ کے ساتھ نماز پڑھنا پسند کرتی ہوں۔ آپ نے فرمایا: مجھے پتا ہے کہ تم میرے ساتھ نماز پڑھنا پسند کرتی ہو، حالانکہ اپنی خواب گاہ کے اندر تمھاری نماز اپنے کمرے میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور اپنے کمرے کے اندر تمھاری نماز اپنے احاطے میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور احاطے کے اندر تمھاری نماز اپنے قبیلے کی مسجد میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے اور اپنے قبیلے کی مسجد میں تمھاری نماز میری مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے۔'' راوی کا قول ہے کہ انھوں نے حکم دیا تو ان کے گھر کے انتہائی دور دراز اور انتہائی تاریک حصے میں ان کے لیے مسجد بنائی گئی۔ وہ اپنی وفات تک اسی میں نماز پڑھتی رہیں۔ حدیث میں بیت سے مراد خواب گاہ اور کمرے سے مراد ڈرائنگ روم ہے۔ پہلے میں نماز دوسرے میں نماز سے افضل ہے۔ اور ڈرائنگ روم میں نماز گھر کے احاطہ (آنگن) میں نماز سے افضل ہے اور احاطے میں نماز قبیلے کی مسجد میں نماز سے افضل ہے۔ جوں جوں جگہ تنگ اور وحشت زدہ ہوتی جاتی ہے، نماز افضل ہوتی جاتی ہے۔

ابن خزیمہ نے جس باب میں اس مسئلے کا ذکر کیا ہے، اس کا عنوان رکھا ہے 'صلاة المراة فی بیتها افضل من صلاتها فی مسجد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم وان قول النبی علیه الصلاة والسلام صلاة فی مسجدی هذا افضل من الف صلاة فیما سواء من المساجد انما اراد به صلاة الرجال دون صلاة النساء'، ''عورت کی اپنے گھر (خواب گاہ) میں نماز مسجد نبوی میں نماز سے افضل ہے اور یہ جو نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ: میری اس مسجد میں نماز دوسری مسجدوں میں ایک ہزار نمازوں سے افضل ہے۔ اس سے مراد مردوں کی نماز ہے نہ کہ عورتوں کی۔''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ بات درست ہے تو نبی کریم پورے دس سال فجر سے لے کر عشا کی نماز با جماعت پڑھنے کی عورتوں کو اجازت کیوں دیتے رہے؟ آپ نے ان کے داخل ہونے کے لیے مسجد کا ایک دروازہ کیوں مخصوص کیا؟ اس مشقت کو اٹھانے کی بجائے انھیں گھروں میں رہنے کی نصیحت کیوں نہ کی؟ اس ڈر سے کہ ماں کی توجہ نماز سے ہٹ نہ جائے آپ نے شیر خوار بچے کے رونے کی آواز سن کر نماز فجر میں دو چھوٹی سورتوں کی تلاوت پر اکتفا کیوں کیا؟ آپ نے یہ کیوں فرمایا کہ اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مسجدوں میں جانے سے نہ روکو؟ رسول کریم کی وفات کے بعد خلافت راشدہ میں عورتوں کی صفیں کیوں بڑھ گئیں؟

بے شک ابن حزم نے عورتوں کو مسجد میں نماز پڑھنے سے روکنے والی احادیث کی تکذیب کر کے اپنے آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی سکون پہنچایا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اصطلاحات حدیث کے علما کا قول ہے جب کسی ثقہ راوی کی مخالفت اس سے بڑھ کر ثقہ راوی کرے تو وہ حدیث شاذ شمار ہوگی۔ اور اگر راوی ثقہ نہ ہو، بلکہ ضعیف ہو تو حدیث متروک اور منکر ہوگی۔

صحیحین (صحیح بخاری اور مسلم) میں کوئی ایسی حدیث وارد نہیں جس سے عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع کرنے کا مفہوم نکلے۔ یہ ساری کی ساری روایتیں مردود ہیں۔ اگر ایک ضعیف راوی عملی مشہور و متواتر سنت کے خلاف حدیث بیان کرے تو پھر کیا کیفیت ہوگی؟ اس کی مروی حدیث تو آغاز میں سے خارج از امکان ٹھہرے گی۔

مسلمانوں پر ایسا وقت بھی آیا جب صحیح سنت مردہ ہوگئی۔ یہ المیہ ابھی تک باقی ہے اور ایسے معاشرے اس المیے کی طرف داری کرتے ہیں جن کو متروک و منکر روایات کے علاوہ کسی بات کا علم نہیں۔ اگر عورت بن سنور کر نماز با جماعت میں حاضر ہو تو ممانعت قابل قبول ہے، کیونکہ مسجدوں میں جانا زیب و زینت کی نمایش اور فتنہ پھیلانے کے لیے نہیں، وہ تو اللہ کو راضی کرنے کی ایک کاوش اور تقویٰ کی تخم ریزی کا ایک موقع ہے۔

عورتوں کو اس شر سے روکنا تو اللہ کے رسول کے اس حکم کے نفاذ کے لیے ہے کہ ''وہ خوش بو لگا کر نہ نکلیں۔'' یعنی عام سا لباس پہن کر قدرتی وضع قطع کے ساتھ نکلیں نہ کہ خوش بو لگا کر متکبرانہ چال ڈھال کے ساتھ۔ رہی بات عورتوں کے لیے مسجدوں میں جانے کی حرمت کا حکم، تو یہ ایک ایسا مسلک ہے جس سے اسلام کا کوئی واسطہ نہیں۔

'و باللّٰہ تعالٰی التوفیق'۔

اعتذار

''اشراق'' جنوری ۲۰۰۶ کے نقطۂ نظر کے کالم میں ''مسجد اور عورت'' کے زیر عنوان پروفیسر خورشید عالم صاحب کا مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کے ابتدائی صفحہ پر ''مسجد اور عورت کے مسئلہ پر'' تدوین کی غلطی سے ''عورت کی امامت کا مسئلہ'' کے الفاظ شائع ہو گئے ہیں۔ اس پر ہم مصنف اور قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔ تصحیح کے بعد جملہ اس طرح پڑھا جائے گا: ''مسجد اور عورت کے مسئلہ پر امام ابن حزم نے 'المحلیٰ' کی جلد سوم صفحہ ۱۲۹ سے صفحہ ۱۴۰ تک تفصیل سے بحث کی ہے۔''

—— ادارہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

خالد مسعود

بنی اسرائیل میں ایک عظیم رسول کی آمد کی خبر

[جناب خالد مسعود صاحب کی تصنیف ''حیات رسول امی'' سے انتخاب]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

——— ۱ ———

اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ فرمایا تھا کہ ان کی نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کی مانند کر دے گا تو یہ وعدہ پورا ہوا۔ ان کی نسل ان کے دونوں بیٹوں، اسماعیل اور اسحاق، سے خوب پھیلی اور دو عظیم شاخیں بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل کے نام سے وجود میں آئیں۔

بنی اسرائیل

حضرت اسحاق کے دو بیٹے عیسو اور یعقوب ہوئے۔ یعقوب، جن کا اصل نام اسرائیل تھا، کے بارہ بیٹے تھے۔ ان کی نسل بارہ قبیلوں کی شکل میں پھیلی اور بنی اسرائیل کہلائی۔ یعقوب کے بیٹے یوسف سوتیلے بھائیوں کی زیادتی کے نتیجہ میں غلام بن کر مصر میں بکے۔ وہاں طویل آزمایش سے گزرنے کے بعد ان کو بادشاہ کے دربار میں رسوخ حاصل ہوا تو انھوں نے اپنے والدین اور تمام بھائیوں کو کنعان کی کٹھن زندگی چھوڑ کر مصر میں آباد ہونے کی پیش کش کی۔ حضرت یعقوب نے اسے قبول کر لیا۔ چنانچہ یہ پورا خاندان مصر کو نقل مکانی کر گیا۔ ابتدائی ادوار میں تو ان کو وقار اور عزت کی زندگی ملی، لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ مصریوں کی اگلی نسلوں میں یوسف سے عقیدت بھی کم ہو گئی اور بادشاہت بھی ایک ایسے خاندان میں چلی گئی جو ان کا نقاد اور بنی اسرائیل کے وجود کو مصر پر ایک بوجھ سمجھتا تھا۔ اس

خاندان نے بنی اسرائیل کو غلاموں کی حیثیت دے دی اور ان سے بیگار لی جانے لگی۔ کنعان سے آنے کے چند سو سال بعد ان کے اندر موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے جن کو اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب پر فائز کیا۔ انھوں نے اپنی قوم کو منظم کیا، ان کو فراموش کردہ آبائی دین کی از سر نو تعلیم دی اور ایمان کے تقاضے بتائے۔ انھوں نے مصر کے حکمران فرعون سے مطالبہ کیا کہ وہ بنی اسرائیل پر ظلم نہ ڈھائے اور ان کو اپنے قدیم وطن کو لوٹنے کی اجازت دے دے۔ برس ہا برس کی کش مکش کے بعد فرعون نے بنی اسرائیل کو اجازت تو دے دی، لیکن پھر وعدہ خلافی کر کے اپنے لاؤ لشکر سمیت ان کے تعاقب میں نکلا۔ اس وعدہ خلافی اور اللہ کے رسول کی نافرمانی کی سزا کے طور پر فرعون اور اس کا لشکر سمندر میں غرق ہو گئے اور اہل مصر کے باغ و چمن آسمانی آفت سے تباہ ہو گئے۔

حضرت موسیٰ کی پیشین گوئی

عبور دریا کے بعد بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ کیا۔ تمام جہان والوں میں سے ان کو اپنی ہدایت کا پرچار کرنے کے لیے منتخب کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کو انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ آسمانی کتاب، جو واضح احکام پر مبنی تھی، تحریری شکل میں عطا ہوئی اور انھوں نے بنی اسرائیل سے بار بار اس بات پر عہد لیا کہ وہ اس کتاب کو اپنی رہنما کتاب کی حیثیت دیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ اپنی وفات سے قبل انھوں نے بطور وصیت ایک بار پھر قوم کو جمع کر کے تمام احکام پر عمل کرنے کا عہد لیا۔ اس موقع پر انھوں نے بطور خاص آیندہ آنے والے ایک نبی کے مبعوث ہونے کی خبر دی، اس کی خصوصیات و علامات بتائیں اور اس کی بعثت کے وقت اس پر ایمان لانے کی تلقین فرمائی۔ تورات میں اس کا تذکرہ حسب ذیل الفاظ میں ہے:

> ''خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے، میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔'' (استثنا ۱۸: ۱۵)

حضرت موسیٰ کو جب تورات کے احکام ملے تو وہ بنی اسرائیل کے لیڈروں کی ایک جماعت کو بھی کوہ طور پر ساتھ لے گئے تھے تاکہ وہ بھی ان احکام کے عہد میں شریک ہو سکیں۔ تورات کے بیان کے مطابق وہاں بنی اسرائیل نے ایک بہت بڑی آگ کے بیچ میں سے خداوند کی آواز سنی تو دہشت زدہ ہو گئے۔ انھوں نے حضرت موسیٰ سے مطالبہ کیا کہ آیندہ انھیں اس طرح کی صورت حال سے دوچار نہ کیا جائے۔ اسی موقع کا حوالہ دیتے ہوئے حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی وفات کے قریب بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تم کہنے لگے کہ خداوند ہمارے خدا نے اپنی شوکت اور عظمت ہم کو دکھائی اور ہم نے اس کی آواز آگ میں سے آتی سنی۔ آج ہم نے دیکھ لیا کہ خداوند انسان سے باتیں کرتا ہے تو بھی انسان زندہ رہتا ہے۔ سو اب ہم کیوں اپنی جان دیں، کیونکہ ایسی بڑی آگ ہم کو بھسم کر دے گی۔ اگر ہم خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سنیں تو مر ہی جائیں گے کیونکہ ایسا کون سا بشر ہے جس نے زندہ خدا کی آواز ہماری طرح آگ میں سے آتی سنی ہو اور پھر بھی جیتا رہا۔ سو تو ہی نزدیک جا کر جو کچھ خداوند ہمارا خدا کہے اسے سن لے اور تو ہی وہ باتیں جو خداوند ہمارا خدا تجھ سے کہے ہم کو بتانا اور ہم اسے سنیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔'' (استثنا ۵: ۲۴۔ ۲۷)

معلوم ہوا کہ اس موقع پر بنی اسرائیل کو شریعت دینے کے ساتھ ساتھ خدا کے جلال کا مشاہدہ کرایا گیا اور انھوں نے 'سمعنا و اطعنا' کا اقرار کیا۔ البتہ، خوف زدہ ہو کر انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے التجا کی کہ احکام عطا کرنے کا یہ انداز نہایت ہیبت ناک ہے، لہٰذا ہمیں اس میں شریک نہ کیا جائے اور موسیٰ خود ہی احکام حاصل کر کے بتا دیا کریں تو بنی اسرائیل ان کی اطاعت کیا کریں گے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org / www.ghamidi.net

بنی اسرائیل کے عہد کی باقاعدہ تقریب بھی حورب کے مقام پر منائی گئی تاکہ وہ ان کے ہاں یادگار رہے۔ کتاب خروج میں ہے:

''اور موسیٰ نے خداوند کی سب باتیں لکھ لیں اور صبح کو سویرے اٹھ کر پہاڑ کے نیچے ایک قربان گاہ اور بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے حساب سے بارہ ستون بنائے۔ اور اس نے بنی اسرائیل کے جوانوں کو بھیجا جنھوں نے سوختنی قربانیاں چڑھائیں اور بیلوں کو ذبح کر کے سلامتی کے ذبیحے خداوند کے لیے گزرانے۔ اور موسیٰ نے آدھا خون لے کر باسنوں میں رکھا اور آدھا قربان گاہ پر چھڑک دیا۔ پھر اس نے عہد نامہ لیا اور لوگوں کو پڑھ کر سنایا۔ انھوں نے کہا کہ جو کچھ خداوند نے فرمایا ہے اس سب کو ہم کریں گے اور تابع رہیں گے۔ تب موسیٰ نے اس خون کو لے کر لوگوں پر چھڑکا اور کہا دیکھو یہ اس عہد کا خون ہے جو خداوند نے اب سب باتوں کے بارے میں تمھارے ساتھ باندھا ہے۔'' (۲۴: ۴۔ ۸)

گویا معاہدہ کے وقت ذبیحہ کا خون ایک طرف بنی اسرائیل پر چھڑکا گیا اور دوسری طرف قربان گاہ پر، جو خداوند تعالیٰ کی قائم مقام تھی۔ یہ حلف کی ایک قسم تھی۔ اس کا مطلب اس بات کا اظہار تھا کہ بنی اسرائیل اس عہد کی حفاظت میں اپنا خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے اس عہد میں کون سے احکام شامل تھے۔ کتاب خروج میں مشہور و معروف احکام عشرہ (Ten Commandments) کا ذکر بھی ہے اور مزید احکام کا بھی جو چند ابواب میں پھیلے

ہوئے ہیں۔ البتہ، کتاب استثنا میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ خطبہ شامل ہے جو انھوں نے وفات سے قبل بطور وصیت بنی اسرائیل کو دیا۔ اس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

''اے اسرائیلیو! تم ان آئین اور احکام کو سن لو جن کو میں آج تم کو سناتا ہوں تاکہ تم ان کو سیکھ کر ان پر عمل کرو۔ خداوند ہمارے خدا نے حورب میں ہم سے ایک عہد باندھا۔ خداوند نے یہ عہد ہمارے باپ دادا سے نہیں، بلکہ خود ہم سب سے جو یہاں آج کے دن جیتے ہیں، باندھا۔ خداوند نے تم سے اس پہاڑ پر روبرو آگ کے بیچ میں سے باتیں کیں۔ اس وقت میں تمھارے اور خداوند کے درمیان کھڑا ہوا، تاکہ خداوند کا کلام تم پر ظاہر کروں، کیونکہ تم آگ کے سبب سے ڈرے ہوئے تھے اور پہاڑ پر نہ چڑھے۔'' (استثنا۵: ۱۔۵)

یاد رہے کہ حورب کوہ سینا کے دامن میں واقع اس مقام کا نام ہے، جہاں بنی اسرائیل عہد کے لیے جمع ہوئے تھے اور پہاڑ پر زلزلہ طاری کر دیا گیا تھا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ بنی اسرائیل نے یہ التجا کی تھی کہ ان تک احکام پہنچانے کی یہ ہیبت ناک شکل آیندہ اختیار نہ کی جائے۔ وہ موسیٰ علیہ السلام پر اعتماد کریں گے اور وہ جو احکام دیں گے، ان کو قبول کریں گے۔

اپنے اس خطاب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے پچھلے چالیس برس کے رویوں پر تبصرہ کیا، ان کو دیے گئے خاص خاص احکام کی یاد دہانی کرائی اور تلقین فرمائی کہ وہ خداوند کے عہد پر پورا اتریں۔ انھی احکام میں سے حسب ذیل حکم بھی ہے:

''خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے، میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہو گا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے انھی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا، وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے گا تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔'' (استثنا۱۸: ۱۵۔۱۹)

معلوم ہوا کہ حورب کے مقام پر کچھ بنیادی احکام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی موجودگی میں دیے گئے، لیکن جب وہ گھبرا گئے اور یہ درخواست پیش کی کہ باقی احکام حضرت موسیٰ کو دے دیے جائیں تو وہ بے چون و چرا ان کو تسلیم کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ نے باقی احکام و فرامین موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے نازل فرمائے۔ ایک پیغمبر

کے برپا ہونے کا وعدہ اور اس کی ہدایت پر عمل کرنے کا حکم، معلوم ہوتا ہے، بعد میں دیا گیا، لیکن یہ بنی اسرائیل کے قول وقرار کے مطابق ان کے عہد ہی میں شامل تھا۔ لہٰذا موسیٰ علیہ السلام نے حورب کے عہد ہی کے حوالہ سے اس حکم کی یاد دہانی اپنی وصیت میں بنی اسرائیل کو کرائی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس خطاب میں وہ علامات وخصوصیات بیان کر دی گئی ہیں جن کی مدد سے اس پیغمبر کو پہچاننا ممکن ہو سکے جب اس کی بعثت ہو۔ وہ علامات حسب ذیل ہیں:

۱۔ وہ پیغمبر 'بنی اسرائیل کے بھائیوں' میں سے ہوگا۔ یہ اس پیغمبر کے نسب کی اطلاع دی گئی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کا فرد نہیں ہوگا، بلکہ ان کے بھائیوں میں سے ہوگا۔ بنی اسرائیل حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ان کے بھائی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اولاد ابراہیم میں سے اس پیغمبر کو بنی اسماعیل میں پیدا کیا جائے گا۔

۲۔ وہ 'حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند' ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد شکل وصورت کی مماثلت نہیں، بلکہ منصب رسالت کی مماثلت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نمایاں ترین خصوصیات تین ہیں۔ اولاً آپ رسول تھے۔ ثانیاً آپ قانون و شریعت لائے اور ثالثاً آپ کی دعوت کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔ گویا موعود رسول قانون وشریعت لائے گا اور وہ اپنے دعوت دین کے مشن میں کامیاب ہوگا۔

۳۔ اس کی نبوت میں وحی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی پہاڑ پر دہشت ناک مناظر نہیں دیکھنے پڑیں گے جن کے اندر سے لوگ خدا کا کلام سنیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالے گا اور وہ اسے پڑھ کر سنائے گا۔

۴۔ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہر کام کرے گا۔

۵۔ جو شخص اس رسول کی بات نہ مانے گا، اللہ تعالیٰ اس کا محاسبہ فرمائے گا۔

ان خصوصیات وعلامات پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں کامل مطابقت ہے۔ یہ خبر بنی اسماعیل میں پیدا ہونے والے ایک رسول کی ہے جو لوگوں کو اللہ کا کلام سنائے گا اور ان کو احکام یعنی کتاب وحکمت کی تعلیم دے گا۔ گویا اس موقع پر حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنے جد امجد حضرت ابراہیم کی دعا کے حوالہ سے تلقین فرمائی کہ جب وہ رسول پیدا ہوں تو بنی اسرائیل ان کی تعلیم پر کان دھریں اور ان کی اطاعت کریں، ورنہ وہ خدا کے غضب کے مستحق ٹھہریں گے۔ قرآن کے مطابق حضرت موسیٰ کے بعد آنے والے تمام انبیا بنی اسرائیل کو اس عہد کی یقین دہانی کراتے رہے کہ وہ اس موعود رسول کی بعثت پر اس پر ایمان لائیں گے اور اس کی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

نصرت کریں گے۔اس عہد کو میثاق النبیین کا نام دیا گیا ہے،یعنی نبیوں کا لیا ہوا عہد۔

حضرت داؤد کی پیشین گوئی

حضرت موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کو تورات پر قائم رکھنے اوران کے فرائض کی یاددہانی کے لیےان کے اندر پے در پے نبی مبعوث ہوئے۔ یہ لوگ کنعان میں حکومت بھی کرنے لگے۔ان کے حکمرانوں میں حضرت داؤداورحضرت سلیمان علیہما السلام کو اقتدار کے ساتھ ساتھ نبوت بھی حاصل تھی اور وہ اپنے ہم عصر حکمرانوں پر مادی و روحانی فوقیت رکھتے تھے۔حضرت داؤدکو آسمانی کتاب زبورعطا ہوئی۔اس کے اندر بھی آیندہ پیدا ہونے والے ایک عظیم رسول کی خبران الفاظ میں دی گئی:

''جس پتھر کو معماروں نے رد کیا
وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا
یہ خداوند کی طرف سے ہوا
اور ہماری نظروں میں عجیب ہے
یہ وہی دن ہے جسے خداوند نے مقرر کیا
ہم اس میں شادمان ہوں گےاورخوشی منائیں گے
آہ!اے خداوند، بچالے
آہ!اے خداوند،خوش حالی بخش
مبارک ہےوہ جوخداوند کے نام سے آتا ہے
ہم نےتم کوخداوند کےگھر سے دعا دی ہے۔'' (زبور۱۱۸: ۲۲۔۲۶)

اس اقتباس سے بھی چند باتیں ایسی نمایاں ہوتی ہیں جوآنے والے نبی کی علامت ہیں۔مثلاً:

۱۔قصر نبوت کی تعمیر میں جولوگ نظر انداز ہوئے ،ان میں یہ پیغمبر آئے گا۔دیکھا جائے تو بنی اسماعیل میں حضرت اسماعیل کے بعدکوئی رسول مبعوث نہیں ہوا تھا،جبکہ بنی اسرائیل میں پے درپے بہت سے نبی آئے۔

۲۔ جو نبی مبعوث ہوگا وہ قصر نبوت کے کونے کا پتھر ہوگا۔یعنی وہ آخری پیغمبر ہوگا جس پر نبوت کامل ہوجائے گی اوراس کے بعدکسی نبی کی بعثت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

۳۔اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر بنی اسرائیل کو حیرت ہوگی کہ نظر انداز ہونے والے لوگوں کو کیوں یہ شرف بخشا گیا

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ہے۔حضرت داؤد دعا کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل اس رسول کی مخالفت سے باز رہیں۔

۴۔اس پیغمبر کے حق میں دعا خداوند کے گھر سے یعنی بیت اللہ میں کی گئی۔ یہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی دعا کا حوالہ ہے۔

۵۔وہ پیغمبر خداوند کے نام سے آ کر برکت دے گا۔دوسرے الفاظ میں خدا کا کلام اس کے پاس ہوگا اور قومیں اس سے برکت حاصل کریں گی۔

بعد میں بنی اسرائیل اپنی ذمہ داریوں کو بھلا بیٹھے۔تورات کو انھوں نے ضائع کر دیا اور مشرک قوموں کے اطوار سیکھ لیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسے دشمنوں کو مسلط کر دیا جنھوں نے قوم کی قوم کو غلام بنا لیا اور یروشلم کے معبد کو تاراج کر دیا۔طویل عرصہ کے بعد اس قوم کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوا۔ان میں مصلحین پیدا ہوئے جن کی باتوں پر انھوں نے عمل کیا۔تورات کو یادداشت کی مدد سے دوبارہ مرتب کیا گیا۔قوم میں شعور پیدا ہوا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر نظر عنایت فرمائی اور ان کو آزادی بخشی۔معبد دوبارہ تعمیر ہوا۔بنی اسرائیل میں پھر سے دین کا چرچا ہوا۔لیکن یہ تبدیلی عارضی ثابت ہوئی۔سابقہ غلط رویے پھر سے غالب آ گئے۔تورات کے حصے بخرے کر کے ان میں تحریف کی جانے لگی۔بنی اسرائیل کی اصلاح کے لیے اب جو نبی یا مصلحین آئے تو قوم نے ان کو خوش آمدید نہیں کہا، بلکہ اصلاح کے لیے تنقید کرنے والی ہر زبان گنگ کرنے کی ٹھان لی۔چنانچہ تاریخ میں کئی نبیوں کے قتل کے واقعات ملتے ہیں۔ اس قوم نے دین کا حلیہ بگاڑ دیا اور نئے دین کو یہودیت (Judaism) کا نام دیا گیا۔بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان میں اتمام حجت کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رسول بنا کر مبعوث کیا۔انھوں نے یہود کو تجدید ایمان کی دعوت دی۔پھر سے دین کے تقاضوں کی وضاحت کی اور تورات کو اس کی اصل روح کے مطابق پیش کیا۔انھوں نے نئے نئے اسالیب اور پیرایوں میں ان کو تعلیم دی، لیکن یہودی علما نے ان کی کسی بات کو نہیں مانا، بلکہ ان کی راہ میں روڑے اٹکانے کے درپے رہے۔بالآخر سازش کر کے ان کی جان لینے کے لیے ان کو رومی حکومت کے حوالہ کر دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جو بات بڑے شدومد سے پیش کی اور اس کو اپنی بعثت کا مقصد قرار دیا، وہ یہ تھی کہ 'آسمان کی بادشاہی نزدیک آ چکی ہے اور میں اس کی راہ صاف کرنے آیا ہوں'۔وہ مختلف شہروں میں جاتے تو اسی حقیقت کو بیان فرماتے۔لہٰذا یہ ضروری ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے ان کے خاص مقصد بعثت کو متعین کیا جائے۔

[باقی]

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمد وسیم اختر مفتی

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

حضرت ابوبکر عام الفیل کے اڑھائی برس بعد ۵۷۲ء میں پیدا ہوئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اڑھائی سال چھوٹے تھے۔ ان کا تعلق قریش کے قبیلہ بنوتیم بن مرہ سے تھا۔ ابوبکر کا شجرۂ نسب اس طرح ہے: عبداللہ بن عثمان بن عامر بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم بن مرہ۔ مرہ ہی پر ان کا شجرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرے سے جاملتا ہے۔ کلاب بن مرہ آپ کے جبکہ تیم بن مرہ ابوبکر کے جد تھے۔ عبداللہ اپنی کنیت ابوبکر اور ان کے والد عثمان اپنے نام کے بجائے اپنی کنیت ابوقحافہ سے مشہور ہیں۔ ابوبکر کی والدہ کا نام سلمٰی بنت صخر اور کنیت ام خیر تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابوبکر کے کئی بھائی بچپن ہی میں فوت ہو گئے تو ان کی والدہ نے ان کی پیدایش سے پہلے نذر مانی کہ اب اگر لڑکا ہوا تو اس کا نام عبدالکعبہ رکھیں گی۔ ان کے بچپن کا یہ نام قبول اسلام کے بعد بدل کر عبداللہ ہو گیا۔ خون بہا، تاوان اور دیتوں (اشناق) کی رقوم کا تعین کرنا بنوتیم بن مرہ کے سپرد تھا۔ تاوانوں کی رقوم وہی وصول اور جمع کرتے، متعلقہ مقدمات بھی انھی کے سامنے پیش ہوتے اور انھی کا فیصلہ نافذ ہوتا۔ ابوبکر جوان ہوئے تو یہ خدمت ان کو سونپی گئی۔ اگرچہ عمر بھر ابوبکر اپنی کنیت سے موسوم کیے جاتے رہے، لیکن اس کنیت کا یقینی سبب معلوم نہیں ہو سکا۔ انھیں جوان اونٹوں (بکر) کی پرورش اور ان کے علاج معالجے سے دل چسپی تھی یا شاید ان کا سب سے پہلے اسلام لانا (بکر الی الاسلام) اس کنیت کا سبب بنا۔ ان کا ایک نام عتیق بھی ہے، جس کے معنی ہیں: خوب صورت اور سرخ وسفید، شروع سے نیک۔ ایک سبب یہ ہے کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو دیکھ کر فرمایا: ''تم اللہ کی طرف سے دوزخ سے آزاد (عتیق اللہ) ہو'' (ترمذی، رقم ۳۶۷۹) ہمیشہ سچ بولنے اور واقعۂ معراج کی فی الفور تصدیق کرنے کی وجہ سے صدیق کا لقب

ملا۔ان کی رافت وشفقت کی وجہ سے ان کو اواہ بھی کہا جاتا۔

ام القریٰ میں پروان چڑھنے والے ابوبکر اپنے لڑکپن اور جوانی میں اپنے ہم سنوں میں پائے جانے والی برائیوں اور آلایشوں سے محفوظ تھے۔انھوں نے جاہلیت میں بھی کبھی شراب نہ چکھی حالانکہ ان کے اردگرد شراب کے رسیا پائے جاتے تھے۔فکر معاش کی عمر کو پہنچے تو ایک تجارت پیشہ قوم کا فرد ہونے کی بنا پر ان کا میلان تجارت ہی کی طرف ہوا۔انھوں نے کپڑے کی تجارت شروع کی۔ایک پرکشش شخصیت اور عمدہ اخلاق کا مالک ہونے کی وجہ سے انھیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔جلد ہی ان کا شمار مکہ کے بڑے تاجروں میں ہونے لگا۔انھوں نے پہلا تجارتی سفر اٹھارہ برس کی عمر میں کیا، آخری بار مدینہ سے شام کے شہر بصرہ کو گئے۔ان سفروں کی وجہ سے باہر کے تاجر ابوبکر کو خوب پہچانتے تھے۔ابوبکر بیدار عقل، بلند نظر اور قلب سلیم رکھتے تھے۔مکہ کے بہت کم لوگ اس معاملے میں ان کے ہم پلہ تھے۔ڈاکٹر جواد علی کا کہنا ہے کہ ابوبکر لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ماہر علم الانساب تھے، مکہ کے تمام قبیلوں کے نسب ان کو ازبر یاد تھے۔ہر قبیلے کے عیوب ونقائص اور محامد وفضائل سے بخوبی واقف تھے۔

ان کی پہلی شادی بنو عامر کی قتیلہ بنت عبدالعزیٰ سے ہوئی۔اگرچہ ایک بار وہ اپنے شوہر کے ساتھ مدینے بھی گئیں، لیکن مسلمان نہ ہوئیں۔ابوبکر سے علیحدگی اختیار کر کے دوسری شادی کر لی اور مکہ میں مقیم رہیں۔ابوبکر کی دوسری شادی بنو کنانہ کی ام رومان بنت عمر سے ہوئی جو پہلے طفیل بن سخبرہ کی زوجیت میں رہ چکی تھیں۔صرف انھوں نے ہجرت میں ابوبکر کا ساتھ دیا۔تیسری شادی بنو کلب کی ام بکر سے ہوئی، جو مسلمان ہوئیں نہ ہجرت کی۔ابوبکر نے ان کو طلاق دے دی تھی۔بنو خثعم کی اسما بنت عمیس سے ابوبکر کی چوتھی شادی ہوئی جو ان کی وفات کے بعد حضرت علی کی زوجیت میں آئیں۔بنو خزرج کی حبیبہ بنت خارجہ سے ان کی پانچویں شادی ہوئی۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے دوستی بعثت سے پہلے کی ہے۔وہ اس محلے میں رہتے تھے، جہاں خدیجہ بنت خویلد اور دوسرے بڑے تاجر سکونت رکھتے تھے۔جب آپ سیدہ خدیجہ سے شادی کے بعد انھی کے گھر منتقل ہو گئے تو ابوبکر کا آپ سے ربط ہوا۔میل جول بڑھا اور اخلاق وعادات کی مماثلت نے دونوں میں گہری دوستی پیدا کر دی۔کچھ مورخین کا یہ خیال درست نہیں کہ آپ دونوں کے تعلقات اسلام کی آمد کے بعد استوار ہوئے، پہلے محض ہم سایگی اور یکسانی خیالات ہی تھی۔ابوبکر پہلے مرد تھے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نماز ادا کی۔خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں نے جس کسی کو اسلام کی دعوت دی، اس نے کچھ نہ کچھ ہچکچاہٹ اور پس وپیش ضرور دکھائی سوائے ابوبکر بن ابوقحافہ کے۔جب میں نے ان کو اسلام کی طرف بلایا، انھوں نے تامل کیے بغیر میری آواز پر لبیک کہا۔'' (ابن

ہشام) اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اس کی ترویج میں نمایاں حصہ لیا، لوگوں کو انفرادی طور پر اور علانیہ اسلام کی طرف بلایا۔ عثمان بن عفان، عبد الرحمان بن عوف، طلحہ بن عبید اللہ، سعد بن ابی وقاص، زبیر بن عوام اور ابوعبیدہ بن جراح ابوبکر کی کوششوں ہی سے مسلمان ہوئے۔ ابوبکر نے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی نصرت وحمایت بھی کی۔ ایک بار بیت اللہ میں قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جھپٹ پڑے اور کہا: تم نے ہمیں برے انجام کی دھمکی دی ہے اور ہمارے معبودوں کے متعلق بری باتیں کی ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں۔ ان میں سے ایک نے آپ کی چادر کے دونوں پلو پکڑ کر کھینچ لیے (اور گلا گھونٹنے لگا)۔ ابوبکر آپ کا دفاع کرنے کھڑے ہو گئے۔ روتے جاتے اور فرماتے: کیا تم ایک شخص کو محض اس لیے قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے؟ تب انھوں نے آپ کو چھوڑا۔ ابوبکر معروف مال دار تاجر تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت ان کے پاس چالیس ہزار درہم تھے۔ اسی میں سے غلام خرید کر آزاد کرتے اور مسلمانوں کو قوت پہنچاتے۔ ایک روز دیکھا کہ نو مسلم بلال کو ان کے آقا نے کڑی دوپہر میں تپتی ریت پر لٹایا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ کر کہا کہ اسلام چھوڑنے کا اعلان کرو ورنہ ایسے ہی مار ڈالوں گا۔ ابوبکر نے انھیں فوراً مہنگے داموں خرید کر آزاد کر دیا۔ ایک اور اذیتیں پانے والے مسلمان غلام عامر بن فہیرہ کو خرید کر نہ صرف آزاد کیا، بلکہ اپنی بکریاں چرانے کی ملازمت بھی دے دی۔ ہجرت کے بعد پانچ ہزار درہم لے کر مدینہ پہنچے تو وہاں بھی یہ پیسے اسی مصرف میں لاتے رہے۔

واقعۂ معراج کے موقع پر ابوبکر نے حیرت انگیز قوت ایمانی کا مظاہرہ کیا۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں سے فرمایا کہ رات انھوں نے بیت المقدس کا سفر کیا، مسجد اقصیٰ میں نماز پڑھی اور پھر سیر آسمان کو گئے۔ مشرکین مکہ نے آپ کا مذاق اڑایا، مکہ سے شام تک ایک ماہ کی مسافت ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ محمد ایک رات میں دو ماہ کا سفر طے کر کے لوٹ آئیں؟ کچھ مسلمان بھی متردد ہوئے، لیکن ابوبکر نے ان کو گم راہ ہونے سے بچا لیا۔ انھوں نے کہا کہ جو اللہ لمحوں میں آسمان سے وحی اتار دیتا ہے، اس کے لیے کیا دشوار ہے کہ رات بھر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنی مسافت طے کرا دے؟ حق کی بلا تاخیر تصدیق کرنے پر پیغمبر علیہ السلام نے ابوبکر کو صدیق کا لقب عطا فرمایا۔

جب قریش نے بنو ہاشم کا بائیکاٹ کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے کنبے کو شعب ابی طالب میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا تو آپ نے اپنے صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ ایک سو کے قریب صحابہ نے حبشہ کی راہ لی جن میں عثمان بن عفان، جعفر بن ابوطالب اور زبیر بن عوام شامل تھے۔ ابوبکر نے ایک عرصہ سختیاں جھیلیں، جب ان کے لیے عبادت بھی دشوار ہو گئی تو انھوں نے براہ یمن حبشہ جانے کا قصد کیا۔ برک غماد پہنچے تھے کہ

قارہ کے سردار ابن دغنہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے پوچھا: ''کہاں کا ارادہ ہے؟'' فرمایا: ''چاہتا ہوں، کہیں الگ جا کر عبادت کروں۔'' ابن دغنہ نے کہا: ''تم جیسا شخص نکل سکتا ہے نہ نکالا جا سکتا ہے۔'' وہ ان کو واپس لے آیا اور قریش کو اپنی ضمانت دے کر لوٹا۔ ابوبکر جب تک مکہ میں مقیم رہے، حمزہ اور عمر کے ساتھ مل کر قریش کو ایذا رسانی سے روکنے کی کوشش کرتے رہے۔ ظن غالب ہے کہ انھوں نے بنو ہاشم کا مقاطعہ ختم کرانے کی دوڑ دھوپ کی جس کا نتیجہ قدرے دیر بعد ہوا اور کفار ہی کے کچھ انصاف پسندوں نے یہ بائیکاٹ ختم کرایا۔

بیعت عقبہ کے بعد یثرب میں اسلام پھیلنا شروع ہوا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو اس شہر کی طرف ہجرت کرنے کا اذن عطا فرمایا۔ اس موقع پر ابوبکر نے بھی ہجرت کی اجازت مانگی۔ آپ نے فرمایا: ''ابھی ایسا نہ کرو، شاید اللہ ہجرت کے لیے تمھارا کوئی ساتھی پیدا کر دے۔'' یہ آپ کا اپنی طرف اشارہ تھا۔ اسی روز انھوں نے دو اونٹنیوں کا انتظام کر لیا اور اپنے پیارے نبی کی معیت میں مکہ سے کوچ کا انتظار کرنے لگے۔ آخر ایک شام آپ حسب معمول ابوبکر کے گھر آئے اور فرمایا: ''مجھے مکہ سے ہجرت کرنے کا حکم ہوا ہے۔'' ابوبکر نے بے تابی سے کہا: ''یا رسول اللہ! ساتھی کی ضرورت ہو تو آپ کا ساتھ موجود ہے۔'' اسی رات قریش کے نوجوانوں نے آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ آپ نے حضرت علی کو اپنے بستر پر لٹایا اور قریش کے لوگوں کو غفلت میں پا کر اپنے گھر سے نکلے اور ابوبکر کے گھر پہنچے۔ وہ جاگ رہے تھے، فوراً دونوں گھر کی عقبی کھڑکی سے نکلے اور جنوب کی سمت تین میل سے زیادہ کی مسافت طے کر کے غار ثور پہنچے۔ یار غار نے پہلے غار کو اچھی طرح سے دیکھا، کہیں کوئی سانپ، بچھو یا موذی جانور نہ ہو تب اپنے صاحب کو اندر آنے دیا۔ صبح ہوتے ہی قریش نے آپ دونوں کی تلاش میں آدمی دوڑائے۔ ابوبکر گھبرائے تو آپ نے فرمایا، 'لا تحزن ان اللّٰہ معنا' ''مت غم کرو، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' (توبہ ۹: ۴۰) ڈھونڈنے والے نے غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا بنا دیکھا تو واپس پلٹ گیا۔ غار کے اندر ابوبکر نے آپ سے فرمایا: ''اگر ان میں سے کوئی آپ کے قدموں کو دیکھتا تو وہ ہمارا پتا پا لیتا۔'' آپ نے جواب میں فرمایا: ''اے ابوبکر، ان دو کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے جن کا تیسرا ساتھی اللہ ہے؟'' (بخاری، رقم ۳۶۵۳) ابوبکر کے صاحب زادے عبداللہ رات کو آ کر مکہ کی خبریں سناتے پھر دن واپس جا کر مکہ والوں کے بیچ گزارتے۔ ابوبکر کا آزاد کردہ غلام عامر بن فہیرہ صبح ان کی بکریاں چراتے ہوئے جبل ثور لے جاتا تو دونوں ان بکریوں کا دودھ پی لیتے۔ اسما بنت ابوبکر دونوں کا کھانا تیار کرتیں، انھوں نے توشہ دان میں کھانا ڈال کر اپنے بھائی عبداللہ کو دیا، باندھنے کو کچھ نہ ملا تو اپنا کمر بند (نطاق) پھاڑ کر اس سے باندھ دیا، اسی وجہ سے ان کا لقب ذات النطاقین (دو کمر بندوں والی) پڑ گیا۔ تین دن گزرے،

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مشرکین کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑا تو انھوں نے یثرب کا ارادہ کیا۔ ابوبکر کے گھر سے دو اونٹنیاں آ گئیں، ایک اور اونٹ خریدا گیا، ان میں سے ایک پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہوئے، دوسرے پر ابوبکر سوار ہوئے اور تیسرے پر عامر بن فہیرہ بیٹھے۔ عبداللہ بن اریقط ان کا گائیڈ بنا، کافر ہونے کے باوجود آپ نے اس پر اعتماد کیا۔ طلحہ بن عبیداللہ نے ابوبکر کو شام سے سفید کپڑے بھیجے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر یہی کپڑے پہن کر مدینہ پہنچے۔

انیس کہتے ہیں کہ ابوبکر مدینہ میں حبیب بن یساف کے مہمان ہوئے، جبکہ ایوب بن خالد کا کہنا ہے کہ وہ خارجہ بن زید کے ہاں ٹھہرے۔ یہ وہی خارجہ ہیں جنھیں ہجرت کے بعد مدینہ میں مواخات قائم فرماتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کا اسلامی بھائی قرار دیا۔ ان کی زمینوں پر ابوبکر نے کاشت کاری کی، بعد میں انھی کی بیٹی حبیبہ سے ابوبکر کا نکاح ہوا۔ ہجرت کے چندروز بعد ابوبکر کو بخار ہو گیا، یہ مدینہ کی مرطوب آب و ہوا کا اثر تھا۔ محمد بن جعفر کی روایت ہے: ''ابوبکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک سنح میں مقیم رہے'' جو مدینے میں خارجہ کے قبیلے بنوحارث بن خزرج کا محلّہ تھا۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ مشہور تابعی فقیہ عبیداللہ بن عبداللہ فرماتے ہیں: ''جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں گھروں کے لیے زمین تقسیم فرمائی تو ابوبکر کے گھر کے لیے مسجد نبوی کے پاس جگہ متعین فرمائی، مسجد کے مغرب میں واقع ان کے گھر سے چھوٹا سا دریچہ مسجد میں کھلتا تھا۔ اور صحابہ کے گھروں کے بھی ایسے دریچے مسجد میں آنے جانے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ آپ نے اللہ کے حکم سے سارے راستے بند کرائے اور فرمایا: ''اس مسجد میں کوئی دریچہ نہ کھلا رہنے پائے سوائے دریچۂ ابوبکر کے۔'' (بخاری، رقم ۳۹۰۴) رہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا گھر تو اس کا بڑا دروازہ ہی مسجد کے اندر تھا، اسے بند کرنا ممکن نہ تھا۔ حضرت ابوبکر کے مسجد نبوی کے پڑوس والے گھر میں ان کی دوسری بیوی ام رومان، بیٹی عائشہ اور ان کے تمام بیٹے مقیم تھے۔ بعد میں کسی ضرورت کے لیے انھوں نے یہ گھر ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا کو چار ہزار درہم میں بیچ دیا۔ حضرت عثمان کے دور خلافت میں اسے سیدہ حفصہ سے خرید کر مسجد کی توسیع میں شامل کر لیا گیا۔ اب بھی مسجد نبوی کے مغربی کونے میں ترکوں کے عہد کی تحریر 'ھذہ خوخۃ ابی بکر' (یہ ابوبکر کے گھر کا دریچہ ہے) لکھی نظر آتی ہے۔

سیدنا ابوبکر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ دینی حمیت رکھتے تھے۔ وہ بدر، احد، خندق اور تمام غزوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کو شان دار فتح حاصل ہوئی اور مشرکوں کے ستر قیدی ان کے ہاتھ لگے۔ انھوں نے ابوبکر کو بلایا اور رشتہ داری کا واسطہ دے کر جان بخشی کرانے کی درخواست کی۔ ابوبکر نے وعدہ کر لیا۔ سیدنا عمر کی رائے تھی، ان قیدیوں کو قتل کر دیا جائے، لیکن ابوبکر نے اصرار کر کے ان کو

زرفدیہ کے عوض رہا کرالیا۔ جنگ بدر میں ابوبکر وعلی کے بارے میں کہا گیا کہ ایک کا ساتھ جبرئیل نے اور دوسرے کا میکائیل نے دیا۔ جنگ احد میں مسلمانوں کو ابتدائی طور پر فتح ملی، لیکن جب انھوں نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو فراموش کر کے اپنی متعین جنگی پوزیشنیں چھوڑ دیں تو کفار کو غلبہ پانے کا موقع مل گیا، چنانچہ جہاں ستر صحابہ شہید ہوئے وہاں سنگ باری سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر بھی زخم آئے اور آپ کے دو دانت شہید ہو گئے۔ اس دوران میں ابوبکر ان بارہ ثابت قدم صحابیوں میں شامل تھے جنھوں نے آپ کا دفاع کیا۔ ۶ ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکہ چلنے کا حکم ارشاد کیا۔ قریش نے یہ خبر سن کر تہیہ کیا کہ آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ آپ حدیبیہ کے مقام پر فروکش ہوئے اور مکہ والوں پر واضح کیا کہ ہمارا مقصد صرف عمرہ ادا کرنا ہے۔ تب مذاکرات کے بعد وہ مشہور معاہدہ طے پایا جسے صلح حدیبیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی کچھ شرائط مسلمانوں کو ناگوار گزریں خاص طور پر حضرت عمر کا ردعمل بہت سخت تھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ اس موقع پر بھی مطمئن اور پرسکون تھے، انھیں پختہ یقین تھا کہ آپ کا کوئی عمل بھی حکمت سے خالی نہیں اور یہ معاہدہ لازماً مسلمانوں کے حق میں بہتر ثابت ہوگا۔ چنانچہ سورۂ فتح نازل ہونے کے بعد یہ بات واضح ہو گئی۔ صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں نے ذی قعدے ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں عمرہ ادا کیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک میں ابوبکر کو مرکزی سیاہ پرچم عنایت کیا اور کھانے کو خیبر کی کھجوروں کے سوٹوکرے عنایت فرمائے۔ آپ نے انھیں نجد کے سریہ میں امیر بنا کر بھیجا۔ ۹ ھ میں حج فرض ہوا تو آپ نے دین اسلام کا پہلا حج ادا کرنے کے لیے ابوبکر کو امیر الحج مقرر فرمایا۔ وہ تین سو مسلمانوں کو لے کر مکہ پہنچے اور آں حضرت کی ہدایت کے مطابق خطبۂ حج میں اللہ کا اظہار برأت سنایا: 'انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا'' ''بلاشبہ مشرک تو ناپاک (عقیدہ والے) ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ پھٹکیں۔'' (توبہ ۹: ۲۸) اگلے برس ۱۰ھ میں آپ خود حج کرنے مکہ تشریف لے گئے، یہ حجۃ الوداع تھا کیونکہ اس کے بعد آپ کی وفات ہو گئی۔

ایک بار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا: ''تو نے ابوبکر کے بارے میں بھی کوئی شعر کہا ہے؟'' انھوں نے کہا: ''ہاں۔'' آپ نے ارشاد فرمایا: ''کہو، میں سن رہا ہوں۔'' انھوں نے یہ دو شعر پڑھے:

وثانی اثنین فی الغار المنیف وقد

طاف العدو به اذ صعد الجبلا

’’بلند غار (ثور) میں دو افراد میں سے دوسرا، دشمن اس کے گرد چکر لگا چکا تھا جب وہ اس پہاڑ پر چڑھا۔‘‘

وکان حب رسول اللّٰه قد علموا

من البریة لم یعدل به رجلا

’’وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیارا دوست ہے، سب نے جان لیا ہے۔ دنیا میں کوئی آدمی اس کے برابر نہیں ہے۔‘‘

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھل کر مسکرائے حتیٰ کہ آپ کی ڈاڑھیں نمایاں ہو گئیں۔ پھر فرمایا: ’’تو نے سچ کہا حسان، ابوبکر ایسے ہی ہیں جس طرح تو نے کہا۔‘‘ یہ واقعہ ہے کہ آپ کو عورتوں میں عائشہ اور مردوں میں ابوبکر سب سے زیادہ محبوب تھے۔ عمرو بن عاص کی روایت ہے کہ میں نے (غزوۂ ذات سلاسل کے موقع پر) آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ’’آپ کو کون سا انسان سب سے بڑھ کر محبوب ہے؟‘‘ آپ نے فرمایا: ’’عائشہ۔‘‘ میں نے پوچھا: ’’مردوں میں سے کون؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ’’ان کے والد (ابوبکر)۔‘‘ میں نے پوچھا: ’’ان کے بعد؟‘‘ جواب فرمایا: ’’عمر۔‘‘ (مسلم، رقم ۶۱۷۷) آپ کا ارشاد ہے: ’’سنو، میں ہر دوست کی دوستی سے بے نیاز ہوں، اگر میں نے دوست بنانا ہوتا تو لازماً ابوبکر کو دوست بناتا۔ تمھارا ساتھی رسول تو اللہ کا دوست ہے۔‘‘ (مسلم، رقم ۶۱۷۶) ’’ابوبکر میرے بھائی اور میرے ساتھی ہیں۔‘‘ (بخاری، رقم ۳۶۵۶) فرمان نبوی ہے: ’’میری امت میں امت پر سب سے بڑھ کر رحم کھانے والے ابوبکر ہیں۔‘‘ (مسند احمد، مسند انس بن مالک) ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور آپ سے کسی شے کے بارے میں گفتگو کی۔ آپ نے اسے حکم فرمایا: ’’میرے پاس پھر آنا۔‘‘ اس نے کہا: ’’یا رسول اللہ، آپ کا کیا ارشاد ہے، اگر میں دوبارہ آئی اور آپ کو نہ پایا؟‘‘ یہ آپ کی وفات کا کنایہ تھا۔ آپ نے فرمایا: ’’اگر تو نے مجھے نہ پایا تو ابوبکر کے پاس چلی جانا۔‘‘ (بخاری، رقم ۷۲۲۰)

حجۃ الوداع سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ گزرا کہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام نے شام پر فوج کشی کے لیے ایک لشکر کی تیاری کا حکم فرمایا۔ آپ نے اسامہ بن زید کو سپہ سالار بنایا اور ابوبکر و عمر جیسے بڑے بڑے صحابہ کو لشکر کے ساتھ جانے کے لیے ارشاد فرمایا۔ ابھی یہ لشکر مدینہ سے کچھ دور جرف کے مقام تک پہنچا تھا کہ آپ کی علالت کی خبر آ گئی، چنانچہ وہیں پڑاؤ ڈال دیا گیا اور ابوبکر و عمر مدینہ لوٹ آئے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف زیادہ ہو گئی تو بلال آپ کو نماز کی اطلاع دینے آئے۔ آپ نے فرمایا: ’’ابوبکر کو کہو کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔‘‘ حضرت عائشہ نے کہا: ’’یا رسول اللہ، ابوبکر رقت رکھتے ہیں۔ جب آپ کی جگہ (نماز پڑھانے) کھڑے ہوں گے، لوگوں کو (تلاوت) سنا

نہ پائیں گے۔ آپ عمر سے کیوں نہیں کہتے؟'' پھر عائشہ نے حضرت حفصہ سے کہا: یہی بات تم آپ کے گوش گزار کرو۔ حفصہ سے یہ مشورہ دوبارہ سننے پر آپ نے فرمایا: ''تم تو بالکل یوسف کی ساتھی عورتیں ہو (اپنے دل کی بات چھپا کر رکھتی ہو۔ جس طرح زلیخا نے عورتوں کی ضیافت بظاہر ان کی عزت افزائی کے لیے کی، مقصد انھیں حسن یوسف سے مرعوب کر کے اپنی محبت کی صفائی پیش کرنا تھا ایسے ہی عائشہ نے ابوبکر کی نرم دلی کا ذکر کر کے امامت عمر کو سونپنے کی تجویز دی، مقصد ان کو بار خلافت سے بچانا تھا)۔ ابوبکر کو کہو، لوگوں کو نماز پڑھائیں۔'' جب ابوبکر نے نماز پڑھانی شروع کی، آپ نے اپنی بیماری میں کچھ تخفیف محسوس کی، آپ دو آدمیوں کا سہارا لے کر چلے، پاؤں مبارک زمین پر گھسٹ رہے تھے۔ مسجد میں داخل ہوئے، ابوبکر نے آپ کی آہٹ سنی تو پیچھے ہٹنے لگے۔ آپ نے اشارہ فرمایا: ''تم اسی طرح کھڑے رہو۔'' اور خود ابوبکر کے بائیں طرف بیٹھ گئے۔ آپ بیٹھ کر نماز پڑھانے لگے، ابوبکر کھڑے ہوئے آپ کی اقتدا کر رہے تھے اور لوگ ابوبکر کی نماز کی پیروی کر رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ روز بیمار رہے، جب مرض میں کمی محسوس کرتے، خود امامت فرماتے اور جب شدت ہوتی تو ابوبکر جماعت کراتے۔ ایک بار ابوبکر مدینہ میں نہ تھے، بلال نے عمر کو آگے کر دیا۔ آپ نے حجرۂ مبارک سے حکم بھیجا: ''اللہ اور مسلمان یہ پسند کرتے ہیں کہ ابوبکر نماز پڑھائیں۔'' ابوبکر نے آپ کی زندگی میں سترہ نمازیں پڑھائیں۔ آپ نے مرض الموت میں عائشہ سے فرمایا: ''اپنے باپ اور بھائی کو میرے پاس بلاؤ تاکہ میں ابوبکر کے بارے میں ایک تحریر لکھا لوں۔ مجھے اندیشہ ہے، کوئی معترض اعتراض کرے اور (خلافت کی) تمنا کرنے لگے۔ اللہ اور اہل ایمان ابوبکر ہی کو چاہتے ہیں۔'' عائشہ سے پوچھا گیا: ''اے ام المومنین، اگر جانشین مقرر کرنا ہوتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کس کا تقرر فرماتے؟'' ان کا جواب تھا: ''ابوبکر۔'' پھر سوال ہوا کہ ''ابوبکر کے بعد؟'' جواب آیا، ''عمر۔'' پھر دریافت کیا گیا: ''عمر کے بعد؟'' عائشہ نے فرمایا کہ ''ابوعبیدہ بن جراح۔''

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال پیر کے دن دوپہر کے وقت ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابوعبیدہ بن جراح کے پاس آئے اور کہا: ''اپنا ہاتھ پھیلائیں، میں آپ کی بیعت کرتا ہوں، اس لیے کہ آپ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق اس امت کے امین ہیں۔ ابوعبیدہ نے کہا: ''جب سے تم مسلمان ہوئے ہو، تم میں ایسی غفلت میں نے نہیں دیکھی۔ کیا تم میری بیعت کرو گے جبکہ تمھارے بیچ ثانی اثنین صدیق موجود ہیں۔'' اور صحابہ بھی بیعت کے لیے ابوعبیدہ کے پاس پہنچے تو انھوں نے یہی جواب دیا۔ آپ کے انتقال کے بعد انصار سعد بن عبادہ کے پاس اکٹھے ہوئے۔ ابوبکر، عمر اور ابوعبیدہ بن جراح بھی وہاں پہنچے۔ حباب بن منذر انصاری نے جو بدر میں حصہ لے چکے تھے،

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

تجویز پیش کی: ''ایک امیر ہم میں سے ہو، ایک تم میں سے۔ قریش کے ساتھیو، بخدا ہم تمھیں خلافت کے لیے نااہل نہیں سمجھتے، لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ لوگ اقتدار کے مالک بن بیٹھیں گے جن کے بھائیوں اور باپوں کو ہم نے قتل کیا ہوگا۔'' عمر کی حباب کے ساتھ تکرار ہوگئی تو ابوبکر نے گفتگو شروع کی: ''حکمران ہم ہوں گے، تم مددگار ہو گے۔ یوں خلافت ہمارے درمیان آدھی آدھی بٹ جائے گی۔'' انصار میں سب سے پہلے بشیر بن سعد نے بیعت کی۔ عمر ان کے پاس گئے اور کہا: ''اے گروہ انصار، تم نہیں جانتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو لوگوں کو نماز پڑھانے کا حکم دیا؟'' انھوں نے کہا: ''ہاں، بالکل۔'' پھر عمر نے کہا: ''تم میں سے کسے اچھا لگتا ہے کہ ابوبکر سے آگے بڑھے؟'' ان کا جواب تھا: ''اللہ کی پناہ کہ ہم ابوبکر سے آگے ہوں۔'' پھر صحابہ حضرت ابوبکر کی بیعت میں مشغول ہو گئے جو پیر کا باقی دن اور منگل کی صبح سقیفۂ بنی ساعدہ اور مسجد نبوی میں جاری رہی۔ جب ابوبکر کی خلافت کا فیصلہ ہوگیا تو بیعت میں پس و پیش کرنے والوں کو ابوبکر نے خود آمادہ کیا۔ منگل کے دن آپ کو غسل دیا گیا اور بدھ کی رات تدفین عمل میں آئی۔

مطالعۂ مزید: الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، السیرۃ النبویہ (ابن ہشام)، فتح الباری (ابن حجر)، البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)، رحمۃ للعالمین (قاضی سلیمان منصور پوری)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی)، الصدیق ابوبکر (محمد حسین ہیکل)، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام (جواد علی)

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net